الرسالہ

Al-Risāla

November 1997 • No. 252 • Rs. 8

حالتِ فطری قائم ہو تو تمام معاملات درست طور چلتے رہتے ہیں
اور اگر حالتِ فطری میں خلل پڑ جائے تو تمام معاملات،
آخری حد تک بگڑ جاتے ہیں

Size 22×14.5cm,
400 pages

Size 22×14.5cm,
112 pages

Size 22×14.5cm,
144 pages

Size 22×14.5cm,
340 pages

Size 22×14.5cm,
152 pages

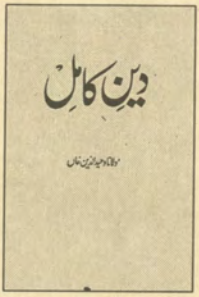

Size 22×14.5cm,
368 pages

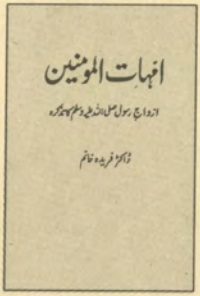

Size 22×14.5cm,
56 pages

Size 22×14.5cm,
172 pages

Size 22×14.5cm,
288 pages

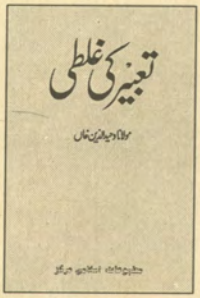

Size 22×14.5cm,
344 pages

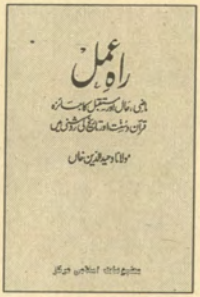

Size 22×14.5cm,
152 pages

Size 22×14.5cm,
128 pages

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدّین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DESU,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

نومبر ۱۹۹۷ ، شمارہ ۲۵۲

فہرست

فہرست	صفحہ
صفتِ مومن	۴
عُسر میں یُسر	۵
قناعت کیجئے	۶
سنجیدہ انسان	۷
مستقبل بینی	۸
دوسروں کی رعایت	۹
اغیار سے تعاون	۱۰
مقام نفوذ	۱۱
صحیح طرز فکر	۱۲
ٹالرنس : فطرت کا اصول	۱۳
مستقبل کو جانئے	۱۴
شر میں خیر	۱۵
مسلم معاشرہ میں جذباتیت کا مسئلہ	۱۶
ہریانہ کا سفر	۲۰
خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۸

صفتِ مومن

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کسی ایک بِل سے دوبار ڈسا نہیں جاتا: لایُلدَغُ المومنُ من جُحرٍ واحدٍ مَرَّتین (فتح الباری بشرح صحیح البخاری، جلد ۱۰/ ۵۴۶

یہ حدیث تمثیل کی زبان میں یہ بتاتی ہے کہ مومن کسی غلط اقدام کا دوبارہ تجربہ نہیں کرتا۔ کسی معاملہ میں ایک بار کا غلط اقدام اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے کہ وہ دوسری بار اس کا اعادہ نہ کرے۔

مومن کے اندر یہ صفت کیسے آتی ہے۔ اس کا راز توبہ ہے۔ ایمان آدمی کے اندر جو ذہن پیدا کرتا ہے۔ اس ذہن کا ایک اہم پہلو توبہ ہے۔ توبہ کے لفظی معنی پلٹنے کے ہیں۔ یعنی آدمی اگر بھول سے ایک غلطی کر جائے تو فوراً ہی اس کے اندر اپنی غلط کاری کا احساس جاگ اٹھے۔ یہ احساس اتنا شدید ہو کہ وہ غلطی کی حالت سے لوٹ کر اصلاح کی حالت کی طرف آجائے۔

ایمان یہ ہے کہ آدمی کے اوپر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں آزاد نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک قادرِ مطلق خدا کی نگرانی میں ہے۔ اور لازمی طور پر ایک ایسا دن آنے والا ہے جب کہ خدا اس کے تمام اعمال کا حساب لے۔ جب کسی آدمی پر یہ سنگین حقیقت منکشف ہوتی ہے تو وہ اس کو اس معاملہ میں انتہائی حد تک حساس بنا دیتی ہے کہ وہ کسی غلطی پر قائم نہ رہے۔ اگر کسی اتفاقی سبب سے اس سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو فی الفور اس کا اندرونی احساس جاگ اٹھتا ہے اور وہ غلطی سے توبہ کر کے اللہ کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔

غلطی پر اصرار نہ کرنے کا یہ جذبہ جو مومن کے اندر آخرت کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے وہی دنیا کے معاملات میں بھی لازمی طور پر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ یہ صفت مومن کی شخصیت کا ایک لازمی جز بن جاتی ہے۔ اسی طرح یہ صفت اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ وہ غلطی پر قائم نہ رہ سکے۔ ایک غلط اقدام کے بعد وہ دوسری بار اس کا تجربہ نہ کرے۔

صحیح عمل سنجیدگی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور غلط عمل غیر سنجیدگی کا۔ سنجیدہ انسان کرنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ ہمیشہ محتاط روش کو اختیار کرتا ہے۔ اس لیے وہ غلط اقدام سے بچ جاتا ہے۔ اس کے معاملہ میں غیر سنجیدہ انسان بے سمجھی اور بے احتیاطی کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس لیے اس کا اقدام غلط بھی ہوتا ہے اور بے نتیجہ بھی۔

عُسر میں یُسر

۴ دسمبر کو ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کے ساتھ لاس اینجلیز گیا۔ وہاں کے اسلامک سنٹر میں چند گھنٹے گزرے۔ امریکی فوج کے تحت کیلی فورنیا میں آرمڈ فورسز ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن براڈ کاسٹ سنٹر کا ادارہ قائم ہے۔ اس کے نمائندہ کے طور پر مسٹر رچرڈ ڈیون پورٹ (Richard Davenport) وہاں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا ادارہ مختلف قسم کے ویڈیو کیسٹ تیار کرتا ہے جو امریکی فوج کے لیے ٹیلی وژن پر دکھایا جاتا ہے۔ یہ پروگرام امریکہ کی تمام فوجی تنصیبات (Bases) پر دیکھا جاتا ہے۔

اس وقت امریکہ کی تقریباً چار لاکھ فوج خلیج عرب کے علاقہ میں ہے۔ مزید فوج بھی وہاں بھیجی جاسکتی ہے۔ چنانچہ امریکی فوجی اسلام اور عرب کلچر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی سے ایک اچھی چیز یہ برآمد ہوئی ہے کہ بہت سے لوگ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں :

The one good thing that came out of this armed forces' presence in the Gulf is that many people are now interested to know more about Islam and Muslim people.

امریکہ کے فوجی ٹی وی کی یہ ٹیم اسی لیے لاس اینجلیز کے امریکی سنٹر میں آئی تھی کہ وہ اسلام کے تعارف پر ایک ویڈیو فلم تیار کرے۔ چنانچہ وہ اس کو تیار کر کے لے گئے اور اس کے بعد اسے امریکی ٹی وی پر فوجی نشریات کے پروگرام میں دکھایا گیا۔

خدا کی اس دنیا میں عُسر (مشکل) میں بھی یُسر (آسانی) کا امکان پایا جاتا ہے۔ یہاں ہر ڈس ایڈوانٹج میں لازمی طور پر ایڈوانٹج کا ایک پہلو موجود رہتا ہے۔

خلیج کی جنگ (۱۹۹۱ء) میں امریکی فوجیں عرب سرزمین میں اتر گئیں۔ اس بظاہر ناخوشگوار واقعہ میں ایک خوش گوار پہلو موجود تھا۔ اس کے دوران امریکیوں کا براہِ راست اختلاط مسلمانوں سے ہوا۔ اس کے بعد فطری طور پر امریکیوں میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ وہ مسلمانوں کے مذہب کو جانیں۔ اس طرح یہ واقعہ اسلام کی تبلیغ کا ایک ذریعہ بن گیا۔

قناعت کیجئے

بنگلہ دیش کے سابق فوجی صدر جنرل محمد ارشاد ایک فوجی بغاوت کے ذریعہ اقتدار میں آئے۔ اس کے بعد دوسری فوجی بغاوت ہوئی۔ جس کے تحت قائم شدہ حکومت نے ان پر بدعنوانی کے کئی مقدمات چلائے۔ پہلے غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے الزام میں تیرہ برس قید کی سزا ہوئی تھی، مالی بدعنوانی کے تحت انھیں مزید سات سال کی سزا کا حکم سنایا گیا۔

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۸ جون ۱۹۹۳) میں اس سلسلے میں جو خبر چھپی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے: جنرل محمد ارشاد اور ان کی اہلیہ روشن کو ڈھاکہ کی خصوصی عدالت نے زمینوں کے لین دین کے سلسلہ میں بدعنوانیوں کا مرتکب قرار دے کر ۷، ۷ برس کی قید کی سزا سنائی۔ جنرل ارشاد نے کئی افراد کو ڈھاکہ کے قیمتی علاقہ میں زمینیں دلوائیں اور پھر ان کا کچھ حصہ ان افراد سے سستے داموں میں خرید کر اس زمین پر "جنتا ٹاور" کے نام سے ایک عمارت تعمیر کروائی اور اس پر خرچ ہونے والی رقم کا بڑا حصہ انھوں نے خود اپنی جانب سے ادا کیا۔ چوں کہ یہ رقم ان کی آمدنی سے زیادہ تھی، عدالت نے مذکورہ تمام آراضی اور جنرل ارشاد کی عمارت کو بحق سرکار ضبط کا حکم دے دیا ہے اب وہ اور ان کی بیوی دونوں جیل میں ہیں۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں اس چیز کو کتنی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جس کو دینی اصطلاح میں قناعت کہا جاتا ہے۔ جنرل ارشاد کا یہ افسوس ناک انجام اس لیے ہوا کہ وہ قناعت نہ کر سکے۔ انھوں نے جنرل کے عہدہ پر قناعت نہ کر کے صدر کے عہدے پر پہنچنا چاہا۔ انھوں نے چھوٹی زمین پر قناعت نہ کر کے بڑی زمین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ایک منزلہ مکان پر قناعت نہ کر کے تیرہ منزلہ مکان کا مالک بننا چاہا۔

انھیں جو کچھ فطری طور پر ملا تھا، اگر وہ اسی پر قناعت کرتے تو وہ اطمینان کے ساتھ ایک پُرمسرت زندگی گزار سکتے تھے، مگر وہ ملے ہوئے پر قناعت نہ کر کے نہ ملے ہوئے پر دوڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزید کی حرص میں وہ ملے ہوئے سے بھی محروم ہو کر رہ گئے۔

زندگی کے مسائل کا حل قناعت ہے نہ کہ حرص۔

سنجیدہ انسان

امریکی میگزین پلین ٹروتھ کے سابق ایڈیٹر کا انتقال ۸۲ سال کی عمر میں ہوا۔ انھوں نے اپنے آخری زمانے میں میگزین کے ایڈیٹوریل میں لکھا تھا کہ اپنی لمبی عمر کے دوران میرا سابقہ اَن گنت لوگوں سے پیش آیا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ دنیا میں سب سے انوکھی چیز کیا ہے تو میں نہ ریڈیم کا نام لوں گا اور نہ پلیٹینیم کا۔ میں کہوں گا کہ دنیا میں سب سے زیادہ نادر اور کامیاب چیز سنجیدگی (sincerity) ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں بہت ہی کم ایسے انسان ملے جو فی الواقع سنجیدہ (sincere) تھے۔

سنجیدگی کیا ہے۔ سنجیدگی دراصل اسی صفت کا اخلاقی نام ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں اخلاص کہا جاتا ہے۔ سنجیدگی اور اخلاص میں درجے کا فرق تو ضرور ہے لیکن ان میں نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سنجیدگی ہی کی ترقی یافتہ صورت کا نام اخلاص ہے۔

سنجیدہ انسان ذمہ دار اور محتاط انسان ہوتا ہے۔ اس دنیا میں حقیقتِ واقعہ کا اعتراف سب سے بڑا فعل ہے۔ اور حقیقتِ واقعہ سے مطابقت سب سے بڑا عمل، اور یہ اعلیٰ انسانی صفت ایک سنجیدہ انسان کے اندر اپنے کامل درجہ میں پائی جاتی ہے۔

سنجیدہ انسان ہمیشہ سچ بولتا ہے، کیوں کہ وہ جھوٹ بولنے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ سنجیدہ انسان بولنے سے پہلے سوچتا ہے کیوں کہ بے فائدہ کلام اس کے مزاج کے مطابق نہیں۔ سنجیدہ انسان اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے کیوں کہ وعدہ کرنے کے بعد اس کی خلاف ورزی اس کو اپنے قتل کے ہم معنی نظر آتی ہے۔ سنجیدہ انسان حق کا اعتراف کرتا ہے، کیوں کہ حق کی وضاحت کے بعد اس کا اعتراف نہ کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ سنجیدہ انسان دلیل کے آگے جھک جاتا ہے۔ کیونکہ دلیل کے آگے نہ جھکنا اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ اس نے خود اپنے وجود کی نفی کر دی ہو۔ سنجیدہ انسان جس نظر سے اپنے آپ کو دیکھتا ہے اسی نظر سے وہ دوسروں کو بھی دیکھتا ہے۔ کیوں کہ دہرا معیار اختیار کرنا اس کو ایسا لگتا ہے جیسے کہ اس نے اپنی حیثیتِ انسانی کو ذبح کر دیا ہو۔ سنجیدہ انسان فطرت کا ایک حسین پھول ہے۔ وہ ایک ایسی بامعنیٰ مخلوق ہے جس سے زیادہ بامعنیٰ مخلوق اس کائنات میں کوئی دوسری نہیں۔

مستقبل بینی

مئی ۱۹۹۲ میں ایک صاحب آندھرا پردیش سے دہلی آئے۔ وہ بطور تحفہ ہمارے لیے آم بھی لائے تھے۔ آم کی ٹوکری پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ آم جب میں نے اپنے یہاں کے بازار سے لیے تو وہ بالکل اچھے تھے۔ مگر راستہ میں شدید گرمی پڑی جس کی وجہ سے اکثر آم خراب ہو گئے۔

میں خاموش رہا۔ اس وقت مجلس میں ایک "باغبان" بھی موجود تھے۔ انھوں نے آم کو دیکھتے ہوئے کہا کہ بھائی صاحب، یہ آم گرمی کی وجہ سے خراب نہیں ہوئے ہیں بلکہ آپ کی ایک غلطی کی وجہ سے خراب ہوئے ہیں۔

پھر باغباں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اپنے یہاں کی مارکٹ سے جب آم لیے تو کیا وہ پکے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ باغباں نے کہا کہ خراب ہونے کی وجہ یہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ پکے ہوئے آم مقامی استعمال کے لیے ہوتے ہیں۔ جب آم کو دور لے جانا ہو تو اس وقت کچے آم خریدے جاتے ہیں۔ اگر آپ نے کچے آم لیے ہوتے تو ایک آم بھی خراب نہ ہوتا۔ سب کے سب اچھی حالت میں یہاں تک پہنچ جاتے۔

اس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاملات میں مستقبل بینی کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ جب بھی آپ ایک ایسا منصوبہ بنائیں جس کی تکمیل آئندہ ہونے والی ہو تو ایسی صورت میں صرف حال کا علم کافی نہیں۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ آپ مستقبل کو جانیں، آج کے دائرے سے اوپر اٹھ کر کل پیش آنے والے واقعات سے واقفیت حاصل کریں۔

منصوبہ حال میں بنایا جاتا ہے مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ مستقبل میں نکلتا ہے۔ منصوبہ بندی حقیقتاً نام ہی مستقبل کی منصوبہ بندی کا ہے۔ اس قسم کا کامیاب منصوبہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وقتی جوش کے بجائے سوچ سے کام لیا جائے، جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ حال کے مسائل کو اہمیت دینے سے زیادہ مستقبل میں پیش آنے والے حالات کا لحاظ کیا جائے۔

دوسروں کی رعایت

آپ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑا رہے ہیں۔ سامنے سے دوسری گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ اب آپ کے لیے دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ پہلے کی طرح بیچ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑاتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ اپنی گاڑی کو ایک طرف موڑ دیں اور سامنے والی گاڑی کے کنارے سے نکل جائیں۔

ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر آپ ہمیشہ یہ کرتے ہیں کہ اپنی گاڑی کو کنارے کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اگر آپ بدستور اپنی گاڑی سیدھے رخ پر دوڑاتے رہیں تو آپ کی گاڑی سامنے والی گاڑی سے ٹکرا جائے گی۔ اس کے بعد آپ کا انجام یہ ہوگا کہ آپ منزل پر پہنچنے کے بجائے قبرستان میں پہنچ جائیں گے یا زخمی ہو کر اسپتال لے جائے جائیں گے۔ مگر جب آپ اپنی گاڑی کو کنارے کی طرف موڑ دیتے ہیں تو آپ کی گاڑی اور آپ دونوں محفوظ حالت میں منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہی اس دنیا میں زندگی کا راز ہے۔ سڑک پر کوئی سواری اکیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ اور بہت سی سواریاں سڑک پر دوڑ رہی ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر ایک کو دوسرے کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ یہی معاملہ وسیع تر معنوں میں پوری انسانی زندگی کا ہے۔ موجودہ دنیا میں آپ اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے دوسرے انسان بھی آباد ہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی سرگرمیوں کو پوری طاقت کے ساتھ جاری کیے ہوئے ہے۔ ایسی حالت میں وسیع تر زندگی میں بھی کامیابی کا راز وہی ہے جو محدود معنوں میں سڑک کے سفر میں اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کرنا۔

آپ جس طرح اپنے جذبات کو جانتے ہیں اسی طرح آپ کو دوسرے کے جذبات کو بھی جاننا ہوگا۔ آپ جس طرح اپنے منصوبے کو جانتے ہیں اسی طرح آپ کو دوسروں کے منصوبے سے بھی واقف ہونا پڑے گا۔ آپ جس طرح اپنا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اسی طرح آپ کو یہ بھی جاننا ہوگا کہ دوسروں کے کیا مفادات ہیں اور وہ کس طرح ان کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ——— اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو جاننے کے ساتھ دوسروں کو بھی جانیں۔

اغیار سے تعاون

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو یہ ایک بہت نازک سفر تھا۔ یہ سفر مکہ کے مشرکین کے ظلم و تشدد کی وجہ سے کرنا پڑا تھا۔ اس کے باوجود اس سفر کے لیے آپ نے جس گائڈ کا انتخاب کیا وہ مکہ کا ایک غیر مسلم عبد اللہ بن اریقط تھا۔ اسی غیر مسلم گائڈ نے آپ کی رہنمائی کرتے ہوئے آپ کو مکہ سے مدینہ پہنچایا۔

اس سنت سے معلوم ہوا کہ دوسروں سے تعاون لینے میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق کرنا درست نہیں۔ اس طرح کے تعاون کے معاملے میں اہلیت دیکھی جائے گی نہ کہ رشتہ اور مذہب۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی پالیسی ہمیشہ اختیار کی۔ مثال کے طور پر بدر کی لڑائی کے بعد ستر کی تعداد میں غیر مسلم گرفتار کر کے مدینہ لائے گئے۔ یہ لوگ اس زمانہ کے لحاظ سے پڑھے لکھے تھے۔ چنانچہ آپ نے اعلان کیا کہ ان میں سے جو شخص مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھا دے اس کو ہم رہا کر دیں گے۔ اس طرح گویا اسلام کی تاریخ میں خود رسول اللہ کے حکم سے جو پہلا اسکول کھولا گیا اس کے تمام ٹیچر غیر مسلم تھے۔

زندگی کے معاملات میں اس اصول کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کسی کام میں ساتھی اور کارکن کا انتخاب کرتے ہوئے اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے مذہب کا ہے یا غیر مذہب کا، یا اپنی برادری کا ہے یا غیر برادری کا، تو اس سے کام کا معیار ختم ہو جائے گا۔ اس طرح کبھی کوئی کام اعلیٰ معیار پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ کام کو کام کے طور پر دیکھا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ جو کام کرنا ہے اس کام کے لیے زیادہ بہتر اور زیادہ کارآمد کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایسے معاملات میں میرٹ کی بنیاد پر افراد کا انتخاب کیا جائے نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

میرٹ کی بنیاد انتخاب کرنے سے اصل کام کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اور جب کسی اور چیز کو انتخاب کی بنیاد بنایا جائے تو اسی چیز کو فروغ حاصل ہوگا جس کو انتخاب کی بنیاد بنایا گیا ہے۔

مقامِ نفوذ

مالی کو ایک پودا لگانا تھا۔ اس نے باغ میں ایک گڑھا کھودا۔ اس کی زمین نرم کرنے کے لیے اس نے گڑھے میں ایک بالٹی پانی ڈالا۔ کچھ دیر کے بعد پانی سوکھ چکا تھا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں زمین کے نیچے ایک سوراخ تھا۔ اس سوراخ سے سارا پانی نیچے چلا گیا۔

یہ فطرت کا اصول ہے جس کو پانی نے عملی طور پر برت کر دکھایا۔ پانی نے ایسا نہیں کیا کہ وہ گڑھے کی سخت جگہ پر ٹکرا کر وہاں اپنا راستہ بنانے کی کوشش کرے۔ بلکہ اس نے گڑھے کے اندر اپنے لیے ایک مقامِ نفوذ (penetration point) تلاش کیا۔ اور وہاں سے راستہ بنا کر اندر داخل ہو گیا۔

فطرت کا یہی اصول انسانی زندگی کے لیے بھی ہے۔ انسانی معاشرہ میں جب بھی آپ کو کوئی کام کرنا ہو خواہ وہ مادی معنوں میں کوئی دنیوی کام ہو یا اخروی معنی میں دعوت و تبلیغ کا کام، آپ کو سب سے پہلے اپنے ماحول کا مطالعہ کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ آپ کے لیے مقام نفوذ کیا ہے۔ وہ کون سا نقطہ ہے جہاں پر عمل کر کے آپ بآسانی اپنے لیے ایک گزرگاہ پا سکتے ہیں۔ جہاں سے اپنے عمل کا آغاز کر کے آپ اپنے لیے مستقبل کی وسیع تر راہیں تلاش کر سکتے ہیں۔

انسان جب بھی کوئی منصوبہ بناتا ہے تو اس کا ایک آخری نشانہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مکان تعمیر کرنا ہو تو اس کا آخری نشانہ اوپر کی چھت ہوگا۔ لیکن آپ اپنے مکان کی تعمیر اوپر کی چھت سے نہیں کر سکتے۔ آپ کو لازمی طور پر اپنے مکان کا آغاز اس کی بنیاد سے کرنا ہوگا۔

یہی معاملہ تمام انسانی کاموں کا ہے۔ ہر کام کا ایک نقطۂ آغاز ہے، اور دوسرا اس کا نقطۂ اختتام۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دونوں چیزوں کے فرق کو سمجھے۔ وہ اس حقیقت کو جانے کہ ابتدائی مقام سے آغاز کر کے وہ اپنے مطلوب اختتام تک تو پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے منصوبہ کے اختتامی نقطہ سے آغاز کرنا چاہے تو وہ کہیں بھی نہیں پہنچے گا، خواہ وہ عمل کے نام پر صدیوں تک اپنی کوششیں جاری رکھے ——— یہی اس دنیا کے لیے خدا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے۔

عمل کے نقطۂ اختتام کو جاننا جوش ہے۔ اور عمل کے نقطۂ آغاز کو جاننا ہوش۔

صحیح طرزِ فکر

قرآن کے مختلف بیانات پر غور کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حقیقت خواہ کتنی ہی واضح ہو، خواہ وہ خدا کی محفوظ کتاب (قرآن) میں بیّنات کی زبان میں ادا کی گئی ہو، تب بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی اس کو صحیح طور پر جان لے اور اس کے مطابق صحیح طور پر اپنے آپ کو ڈھال لے۔ حقائق سے صحیح رہنمائی کے لیے صحیح ذہن کا ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس لیے جو شخص اس دنیا میں ہدایت کی زندگی گزارنا چاہتا ہو اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے طرزِ فکر کو درست کرے۔

یہی وہ بات ہے جو قرآن میں مختلف آیتوں میں واضح کی گئی ہے۔ ایک آیت میں فرمایا کہ کہہ دو کہ ہر ایک اپنے شاکلہ پر عمل کرتا ہے اور تمہارا رب ہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ کون شخص زیادہ درست راستہ پر ہے (قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ۔ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا) الاسراء ۸۴

اس آیت میں شاکلہ سے مراد میلان طبع ہے۔ یعنی ہر آدمی اپنے میلان طبع کے مطابق رائے قائم کرتا ہے اور اپنے میلان طبع کے تحت قائم کی ہوئی رائے پر چلتا ہے۔ مگر صحیح میلان طبع وہ ہے جو خدا کی معرفت اور خدا کی ہدایت کے تحت بنا ہو۔

موجودہ دنیا میں صحیح یا غلط رویہ کے لیے یہی میلان طبع (شاکلہ) اصل فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کے اوپر ہدایت اور ضلالت کا مدار ہے۔ اس لیے جو شخص یہ چاہتا ہو کہ دنیا میں خدا کی پسند والی زندگی گزارے اور آخرت میں خدا کے پسندیدہ بندوں میں شمار کیا جائے اس پر لازم ہے کہ وہ سب سے زیادہ توجہ کے ساتھ اپنے شاکلہ کو درست کرے۔ کیوں کہ بگڑے ہوئے شاکلہ والا آدمی ہدایت سے بھی محروم رہے گا اور نتیجۃً اللہ کی نصرت و رحمت سے بھی۔

سوچنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے متاثر ذہن کے تحت سوچنا اور دوسرا ہے غیر متاثر ذہن کے تحت سوچنا۔ جب بھی آدمی اپنے ذہن کے خانہ میں سوچے گا اس کی سوچ خلافِ واقعہ ہو جائے گی۔ اور جب آدمی خارجی حقیقتوں کی رعایت کرتے ہوئے سوچے تو اس کی سوچ مطابق حقیقت سوچ ہوگی اور مطابق حقیقت سوچ ہی کا دوسرا نام صحیح سوچ ہے۔

ٹالرنس: فطرت کا اصول

ٹالرنس (رواداری، برداشت) ایک یونیورسل اصول ہے۔ شیر اور ہاتھی دونوں انتہائی بڑے جانور ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے حریف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی دونوں ایک ساتھ جنگل میں رہتے ہیں۔ یہ صرف ٹالرنس کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ جنگلوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک طرف سے ہاتھی آرہا ہو اور دوسری طرف سے شیر گزر رہا ہو تو دونوں اپنا اپنا راستہ بدل کر دائیں اور بائیں سے نکل جاتے ہیں۔ اگر دونوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ نہ کریں تو دونوں آپس میں لڑنے لگیں، یہاں تک کہ دونوں لڑ کر تباہ ہو جائیں۔

شیر اور ہاتھی کو یہ طریقہ فطرت نے سکھایا ہے۔ اسی طرح انسان کے جسم میں فطرت نے ٹالرنس کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ میڈیکل سائنس میں اس کو حیاتیاتی ٹالرنس (biological tolerance) کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایک جسم حیوانی کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک چیز سے برا اثر لیے بغیر اس سے ربط کو یا جسم میں اس چیز کے داخل کیے جانے کو برداشت کرے:

The ability of an organism to endure contact with a substance, or its introduction into the body, without ill effects. (X/31)

جسم کی اسی صلاحیت پر امراض کے علاج کا پورا نظام قائم ہے۔ بیماری کے وقت جسم کے اندر ایسی دوائیں ڈالی جاتی ہیں جو مجموعی حیثیت سے جسم کے لیے مضر ہیں۔ مگر جسم خارجی چیزوں کے معاملہ میں اپنی ساری حساسیت کے باوجود ایسی دواؤں کو برداشت کرتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ کرتا ہے۔ اسی "حیاتیاتی ٹالرنس" کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ یہ دوائیں جسم میں داخل ہو کر اپنا اثر دکھائیں۔ وہ جسم کے اعضاء پر برا اثر ڈالے بغیر اس کے بیمار عضو پر عمل کر کے اس کو اچھا کر سکیں۔

ٹالرنس کا یہی طریقہ انسانی سماج میں بھی مطلوب ہے۔ جنگل کے جانور جو کچھ اپنی جبلت (instinct) کے تحت کرتے ہیں۔ اور انسانی جسم جو کچھ اپنی فطرت کے تحت کرتا ہے۔ وہی انسان کو اپنے شعور کے تحت کرنا ہے۔ اس کو اپنے سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت ٹالرنس کا طریقہ اختیار کر کے دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔

مستقبل کو جانئے

جان بیٹ (John Bate) سترھویں صدی عیسوی کا ایک برٹش مرچنٹ تھا۔ ۱۶۰۶ کا واقعہ ہے کہ اس نے باہر سے کچھ کشمش (Currants) امپورٹ کی۔ ملک میں داخل ہونے کے بعد جب اس کے سامان پر ٹیکس لگایا گیا تو اس نے ٹیکس کی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہ ایک شاہی ٹیکس ہے جس کو کنگ جیمز فرسٹ (۱۶۲۵-۱۵۶۶) نے خود اپنے اختیار سے جاری کیا ہے۔ پارلیمنٹ نے اس کے حق میں قانون نہیں بنایا ہے۔ انگلستان کے حکمراں جیمز فرسٹ نے شاہی مالیات کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اس قسم کے کچھ ٹیکس نافذ کیے تھے۔

عدالت زیریں کے جج نے کنگ کے مطلق اختیار (absolute power) کا حوالہ دیتے ہوئے اس ٹیکس کو جائز قرار دے دیا۔ جان بیٹ اس کے بعد عدالت عالیہ میں گیا۔ اس وقت سر ایڈورڈ کوک (Sir Edward Coke) عدالت عالیہ کے چیف جسٹس تھے۔ انھوں نے مقدمہ کی سماعت کرنے کے بعد جان بیٹ کے حق میں فیصلہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ بادشاہ کو پارلی منٹ کی اجازت کے بغیر از خود کوئی ٹیکس عائد کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

جسٹس کوک کے اس فیصلہ پر بادشاہ بہت برہم ہوا۔ اس نے اپنے شاہی اختیارات سے جسٹس کوک کو عدالتی عہدہ سے ڈسمس کر دیا، اور اپنے حکم کے تحت شاہی ٹیکس کے قانون کو دوبارہ بحال کر دیا (3/240-14)

اس واقعہ کو اب تقریباً چار سو سال گزر چکے ہیں۔ آج صورت حال مکمل طور پر بدل چکی ہے۔ آج برطانیہ میں اور دوسرے ملکوں میں مسلّم طور پر مان لیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ سب سے بڑا قانونی ادارہ ہے۔ بادشاہ یا کوئی بھی شخصیت اس کے ماتحت ہے نہ کہ اس کے اوپر۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ ایسے الفاظ بول رہا ہے جو آئندہ بے حقیقت ہو جانے والے ہیں۔ ہر انسان ایسے عمل میں سرگرم ہے جس کی کوئی قیمت اس کو موت کے بعد کی زندگی میں ملنے والی نہیں۔ کامیاب وہ ہے جس کا قول و عمل آخرت کی دنیا میں باوزن ٹھہرے، اور ناکام وہ ہے جس کا قول و عمل آخرت میں بے وزن ہو جائے۔

شر میں خیر

شرک کیا ہے۔ شرک دراصل فطرت کی پرستش (nature worship) کا دوسرا نام ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی کے اسلامی انقلاب نے جب شرک کے غلبہ کو ذہنوں سے ختم کیا تو اسی کے ساتھ فطرت کو مقدس سمجھ کر اس کو پوجنے کا ذہن بھی ختم ہو گیا۔ اب فطرت کی چیزیں پرستش کا موضوع نہ رہیں بلکہ تحقیق و تسخیر کا موضوع بن گئیں۔ اس طرح انسانی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جو آخر کار جدید سائنسی اور ٹکنکی انقلاب تک پہنچا۔

فطرت کی بے لاگ تحقیق سے جب انسان کو حیران کن فتوحات حاصل ہوئیں تو قدرتی طور پر تحقیق و تفتیش کی عظمت لوگوں کے ذہنوں پر چھا گئی۔ اس طرح جو نیا رجحان پیدا ہوا اس کے زیر اثر ہر چیز کی تحقیق ہونے لگی۔ یہاں تک کہ مقدس مذہب بھی اس کے دائرۂ تحقیق سے نہیں بچا۔ مذہب کے عقائد، مذہب کی کتب اور مذہب سے تعلق رکھنے والی دوسری تمام چیزوں کی بھی کھلی تحقیق شروع ہو گئی۔

سونے کے ایک سو زیور سُنار کے پاس جانچ کے لیے لائے جائیں۔ ان میں سے ۹۹ زیور مشابہ دھات کے بنے ہوئے ہوں۔ صرف ایک زیور خالص سونے کا ہو۔ اب سنار تو زیوروں کو جانچنے کے لیے ان سب کو آگ پر رکھے گا۔ مگر آگ پر رکھا جانا ۹۹ زیوروں کے لیے تو مسئلہ ہے لیکن ایک زیور کے لیے وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ آگ کی تپش ۹۹ زیوروں کا بے حقیقت ہونا ثابت کرے گی۔ لیکن ایک زیور جو خالص سونے کا ہے، اس کا درجہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھا دے گی۔

یہی معاملہ موجودہ زمانہ میں پیش آیا۔ تحقیق کے عمومی ذوق کے تحت جب مذاہب کی علمی جانچ شروع ہوئی تو اسلام بھی اس کی زد میں آگیا۔ اسلام کو بھی اس کی وجہ سے کچھ "آنچ" پہنچی۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو اس "شر" کے اندر "خیر" کا عظیم پہلو چھپا ہوا تھا۔ کیوں کہ اس کھلی تحقیق نے خالص علم انسانی کے معیار پر یہ ثابت کر دیا کہ تمام مذاہب محرف، غیر معتبر اور غیر ثابت شدہ حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ ان کے درمیان صرف ایک مذہب ہے جو ہر طرح قابل اعتبار اور ثابت شدہ ہے۔ اور وہ مذہب اسلام اور صرف اسلام ہے۔

مسلم معاشرہ میں جذباتیت کا مسئلہ

ہندستان کے مسلم معاشرہ میں بظاہر بہت سے مسائل دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو تمام مسائل کی جڑ صرف ایک نظر آئے گی۔ اور وہ مسلمانوں کی بڑھی ہوئی جذباتیت ہے۔

مسائل زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ بے مسائل زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب مسائل پیش آئیں تو کیا کیا جائے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ جلد بازی چھوڑ کر صبر و تحمل کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یہ اصول قرآن میں واضح طور پر موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا :

پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا،
اور ان کے لیے جلدی نہ کرو (الاحقاف ۳۵)

انفرادی یا اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ پیش آئے تو اس کے مقابلہ میں ردعمل کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک ہے فوری اور جذباتی جواب (emotional response) اور دوسرا ہے سوچا سمجھا ہوا جواب (considered response)۔ پہلے قسم کے ردعمل کا نام عجلت ہے اور دوسرے قسم کے ردعمل کا نام صبر۔ عجلت ہر قسم کی ناکامی کا راز ہے۔ اور صبر ہر قسم کی کامیابی کا راز۔

زندگی کا نظام فطرت کے قانون پر چل رہا ہے۔ یہ قانون مسابقت اور کامپٹیشن ہے۔ اسی کو قرآن میں اس کے انتہائی مفہوم کے اعتبار سے عداوت کہا گیا ہے۔ (البقرہ ۳۶) کوئی بھی اس پر قادر نہیں کہ وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے اس نظام کو بدل سکے۔ مسابقت یا عداوت کا یہ معاملہ خود آدم کے زمانہ میں ہابیل اور قابیل کے نزاع کی صورت میں سامنے آگیا تھا۔ وہ تمام پیغمبروں کے ساتھ پیش آیا۔ اسی طرح وہ قیامت تک برابر جاری رہے گا۔

اب کرنا کیا ہے۔ کرنا یہ ہے کہ جب مسائل پیش آئیں تو مشتعل ہو کر جذباتی ہنگامہ آرائی نہ کی جائے۔ بلکہ اپنے آپ کو تھام کر سوچا جائے۔ اہل افراد سے مشورہ کیا جائے۔ دعا اور استخارہ کیا جائے۔ اس کے بعد ٹھنڈے ذہن کے تحت فیصلہ کر کے اس کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کی جائے۔ جذباتیت غیر منظم عمل ہے، اور صبر اس کے مقابلہ میں منظم عمل۔

بدقسمتی سے ہندستانی مسلمانوں نے پچھلے دو سو سال کے دوران ایک بار بھی صبر والے طریقہ پر

عمل نہیں کیا۔ انھوں نے ہمیشہ ایک ہی طریقہ اختیار کیا۔ کوئی خبر سنی، یا کوئی واقعہ پیش آیا تو فوراً اپنے جذباتی لیڈروں کی رہ نمائی میں بھڑک کر اس کے مقابلہ میں ہنگامہ آرائی کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ردعمل کا یہ انداز فطرت کے قانون کے سراسر خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو سو سال کی لمبی مدت میں ہزاروں پرشور اقدامات اور بے شمار قربانیوں کے باوجود ان کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بلکہ ان کا ہر جذباتی اقدام مسائل میں صرف اضافہ کا سبب بنتا چلا گیا۔

ہندستان کی دو بڑی تحریکوں کو اس کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں انگریزوں کی آمد کے بعد مسلمانوں کو کچھ تلخ تجربے ہوئے۔ اس کے بعد مسلم رہ نماؤں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ حتی کہ مقدس بزرگوں تک کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ "حضرت کو انگریزوں سے بہت نفرت تھی"۔

نفرت صبر کا مظہر نہیں۔ بلکہ عجلت اور جذباتیت کا مظہر ہے۔ چنانچہ جب ہمارے رہ نماؤں کو انگریزوں سے نفرت ہوئی تو وہ اندھا دھند بس ان کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ انھیں اس کے سوا کوئی اور کام نظر نہ آیا کہ جس طرح بھی ہو، انگریزوں کی سیاسی غلامی ختم کر کے آزادی حاصل کریں۔

۱۹۴۷ میں آزادی کا یہ نشانہ پورا ہو گیا۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل مزید اضافہ کے ساتھ باقی رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نفرت اور اشتعال کی بنا پر ہمارے رہ نما یہ سوچ نہ سکے کہ انگریزوں کا ہندستان سے واپس جانا بذات خود مسلمانوں کے مسائل کا حل نہیں بن جائے گا۔ بلکہ انھیں جدید تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو تیار بھی کرنا ہوگا۔

ہندو قوم آزادی کی جدوجہد کے ساتھ تعلیم، صنعت، تجارت وغیرہ میں بھی سرگرم رہی۔ چنانچہ آزادی آئی تو وہ آزادی کے مواقع کو استعمال کرنے کے قابل بھی ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس مسلمان تعمیر و تیاری کے میدان میں پس ماندہ ہونے کی وجہ سے اس قابل نہ تھے کہ آزادی کے مواقع کو استعمال کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آزاد ہندستان کے ہر شعبہ میں ہندو بدرجہا آگے ہیں۔ اور مسلمانوں کے حصہ میں صرف یہ فریاد و ماتم آیا ہے:

یہاں تک گردشِ دورِ فلک سے پست ہونا ہے کہ گردِ راہ بھی کرتی پھرے گی شوخیاں ہم سے

اب دوسری بڑی تحریک کو لیجئے جو بالآخر ملک کی تقسیم پر منتج ہوئی۔ اس تحریک کا آغاز کس طرح ہوا۔

وہ اس طرح ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے پڑوسی ہندوؤں سے کچھ تلخ تجربات پیش آئے۔ مثلاً مسجد کے سامنے باجا بجانا یا "اشتعال انگیز" نعرے لگانا، وغیرہ۔ اس قسم کے تجربات کو لے کر مسلمانوں کے جذباتی رہ نما بھڑک اٹھے۔ انھوں نے پوری قوم کو جذباتیت کا طوفان بنا دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندو متعصب ہیں۔ ہندوؤں کا الگ کلچر ہے۔ ہندو مسلمانوں کے لیے مسئلے پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ایک علاحدہ خطہ (مسلم لینڈ) چاہیے جہاں ہم اس قسم کے مسائل سے محفوظ رہ کر پرامن زندگی گزار سکیں۔

یہ جذباتی تحریک مسلمانوں میں اتنا زیادہ مقبول ہوئی کہ ملت کا بیشتر حصہ اس کے ساتھ ہو گیا۔ یہاں تک کہ مجبوراً ۱۹۴۷ میں ملک کو تقسیم کرنا پڑا۔

اب اگر نتیجہ کو دیکھئے تو وہ نہ صرف صفر ہے بلکہ الٹا نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں پر جو کچھ گزرا یا گزر رہا ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ مگر خود مسلم لینڈ (پاکستان) کی حالت کیا ہے۔ پچھلے پچاس سال سے وہاں شدید تر انداز کی لڑائی جاری ہے۔ پنجابی اور بنگالی کی لڑائی، مہاجر اور سندھی کی لڑائی، شیعہ مسلمان اور سنّی مسلمان کی لڑائی۔ حتیٰ کہ سپاہ صحابہ اور سپاہ محمدی کی لڑائی۔ وغیرہ۔

تقسیم کی تحریک کا یہ الٹا نتیجہ کیوں برآمد ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہندوؤں کی طرف سے جب کچھ تلخ تجربات ہوئے تو اس پر صبر و تحمل کے ساتھ غور نہیں کیا گیا۔ اگر صبر و تحمل کے ساتھ غور کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ یہ "ہندو" کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ انسان کا مسئلہ ہے۔ جہاں بھی کچھ انسان ہوں گے، خواہ وہ کئی مذہب کو ماننے والے ہوں یا ایک مذہب کو ماننے والے، لازماً ان کے درمیان نزاعات پیدا ہوں گے۔ نزاع اور چیلنج سے خالی سماج اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔

تقسیم کے علم بردار اگر غور کرتے تو وہ اس حقیقت کو جان لیتے۔ پھر وہ مسلمانوں سے کہتے کہ تم لوگ ملک کو بٹوا کر اگر علاحدہ مسلم لینڈ بنوا لوگے تو وہاں بھی نزاع جاری رہے گی۔ پھر تم کیا کروگے۔ اس لیے صبر و تحمل کے ساتھ جینا سیکھو۔ زندگی کے مسائل کا حل علیحدگی میں نہیں ہے۔ بلکہ برداشت میں ہے۔ مسلمانوں کو یہ سبق نہیں دیا اس لیے وہ پہلے بھی لڑتے تھے اور اب بھی لڑ رہے ہیں۔

یہ دو تاریخی مثالیں محض ایک اندازہ کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے لیڈروں کی رہ نمائی میں جتنی بھی تحریکیں اٹھائی ہیں وہ سب کی سب جذبات کے تحت اٹھیں اور جذبات ہی کے اوپر ختم ہو گئیں۔ اس کا سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔

اب مسلمانوں کو مزید تباہی سے بچانے کی واحد صورت یہ ہے کہ مذکورہ قرآنی آیت کی روشنی میں انھیں اس معاملہ میں باشعور بنانے کی کوشش کی جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ مسئلہ پیش آنے پر بھڑک اٹھنا یا جذباتی اقدام کرنا کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ ایسا اقدام صرف برعکس نتیجہ والا (counter-productive) ثابت ہوگا اور ہماری تباہی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے تاکہ وہ معاملات کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ وہ باشعور انسان کی مانند جینے والے بنیں۔ وہ سطحی نعروں اور گہری تدبیروں کے فرق کو سمجھیں۔ وہ اس راز کو سمجھیں کہ تباہ کن اچھل کود اور چیز ہے اور نتیجہ خیز اقدام اس سے بالکل مختلف دوسری چیز۔

مسلمانوں کو جب تک جذباتیت اور اشتعال پذیری کے موجودہ گڑھے سے نہ نکالا جائے کسی بھی قسم کی کوئی ترقی ہرگز ممکن نہیں۔

جذباتیت کا یا جذباتی طریقہ کا مہلک ہونا ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے کامن سنس ہی کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام قومیں ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مسلمان دنیا کی واحد قوم ہیں جو موجودہ زمانہ میں استثنائی طور پر جذباتیت کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ اس کی وجہ تمام تر وہ نااہل مسلم رہنما اور بے دانش مسلم دانشور ہیں جنھوں نے ناقابل فہم نادانی کے ساتھ اس قسم کی کارروائیوں کو جہاد بتایا۔ اور اس میں پیش آنے والی تباہی کو شہادت بتا کر اسے آخری حد تک گلوریفائی کیا۔

اس قسم کی باتیں کرنا رہنمائی نہیں ہے بلکہ رہزنی ہے۔ وہ دانش وری نہیں ہے بلکہ سراسر بے دانشی ہے۔ اس غلط ذہنی قیادت نے مسلمانوں کے ذہن کو اتنا زیادہ بگاڑ دیا ہے کہ اب اس کا کوئی فوری حل ممکن نہیں۔ ضرورت ہے کہ خاموشی کے ساتھ لمبی مدت تک مسلمانوں کی ذہنی تعمیر اور فکری اصلاح کی جائے۔ اس کے بعد ہی ان کے لیے کسی حقیقی مستقبل کی امید کی جا سکتی ہے۔

ھریانہ کا سفر

مسٹر دیبی سنگھ تیوتیا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ انھوں نے کچھ اصولی اختلاف کی بنیاد پر اس عہدہ سے استعفاء دے دیا۔ جسٹس تیوتیا نے اس کے بعد ایک پولیٹکل پارٹی بنائی ہے جس کا نام جن ستا پارٹی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد کرپشن سے پاک ہندستان کی تعمیر کرنا ہے۔ ان کی پارٹی کے چھ ایجنڈے میں سے ایک صدفی صد تعلیم کا حصول ہے :

To achieve total literacy within a reasonable time frame.

جن ستا پارٹی کی دعوت پر ھریانہ کا سفر ہوا۔

۱۹ مئی ۱۹۹۵ کی صبح کو دہلی سے گوڑ گاؤں کے لیے بذریعہ کار روانگی ہوئی۔ میرے ساتھ سپریم کورٹ کے سینیر ایڈووکیٹ مسٹر بلونت سنگھ ملک (Tel. 8955901) تھے۔ راستہ میں ان سے معلوماتی گفتگو ہوتی رہی۔

انھوں نے بتایا کہ وہ جاٹ برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہریانہ کے میو پہلے جاٹ تھے۔ پھر وہ مسلمان ہو گئے۔ مگر ان کا رہن سہن بڑی حد تک پہلے ہی کی طرح رہا۔ ہریانہ میں کہا جاتا ہے کہ : جاٹن کا کہا ہندو، میون کا کہا مسلمان۔ یعنی ایک ہی قوم ہے، وہ ہندو ہو تو جاٹ کہی جاتی ہے، اور مسلمان ہو تو اس کو میو کہتے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے مسٹر محمد علی جناح کو چھوڑ کر، تمام بڑے بڑے مسلمان لیڈر متحدہ ہندستان چاہتے تھے۔ مثلاً حکیم اجمل خان، سر خضر حیات، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ۔ پھر ملک تقسیم کیسے ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے آپ سر چھوٹو رام کو پڑھئے۔ ان کے بارہ میں حسب ذیل کتاب بہت جامع اور مستند ہے :

Chhotu Ram—a political biography
by Madan Gopal

اس کتاب میں سر چھوٹو رام کا بیس صفحہ کا وہ خط بھی شامل ہے جو انھوں نے مہاتما گاندھی کو لکھا تھا اور جس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ آپ کسی حال میں بھی بٹوارہ کو مت مانئے۔

سر چھوٹو رام ایک جاٹ لیڈر تھے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں سے اتنا زیادہ قریب تھے کہ عام ہندو ان کو "چھوٹو خان" کہتے تھے۔ رہتک میں جاٹ کالج کے سامنے ان کی سمادھی ہے۔ اس پر اردو رسم الخط میں اقبال کا یہ شعر لکھا ہوا ہے :

خدا کے بندے تو لاکھوں دیکھے پھرے بنوں میں ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

پنڈت لوگ سنسکرت کے سوا کوئی اور زبان سمادھی پر لکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ مگر مسٹر ملک نے بتایا کہ جاٹ لوگ بہت کم برہمن کے اثر میں ہیں۔ وہ درمیانی واسطہ کے بغیر براہ راست خدا سے تعلق پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں جاٹ لوگ بہت آسانی سے اسلام میں داخل ہو گئے۔

آگے بڑھے تو جگہ جگہ دہلی کی تاریخی عمارتیں نظر آئیں۔ انھیں میں سے ایک انڈیا گیٹ تھا۔ موجودہ صدی

کے آغاز میں برٹش حکمرانوں نے اس علاقہ کی تعمیر کی اور ۱۹۱۲ میں ملک کی راجدھانی کو کلکتہ سے نئی دہلی منتقل کیا۔ اس وقت انڈیا گیٹ انگریزوں کے داخلۂ ہند کی علامت تھا، آج وہ ایک گزری ہوئی تاریخ کی یادگار ہے۔

دہلی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ یہ شہر کسی وقت عظیم سلطنتِ دہلی کا مرکز تھا جو تیرھویں صدی سے سولھویں صدی تک قائم رہی۔ سلطنت دہلی کو سلطان محمد غوری نے قائم کیا تھا۔ بابر نے ۱۵۲۶ء میں سلطان ابراہیم کو شکست دے کر دہلی کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ یہ سلطنت مزید وسعت کے ساتھ مغل خاندان میں ۱۸۵۷ء تک باقی رہی۔

جس زمانہ میں سلطنت دہلی عروج پر تھی، اسی زمانہ میں اسپین میں مسلم سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ ۱۴۹۲ء میں جب کہ اسپین کا آخری مسلم بادشاہ ابوعبداللہ قلعہ الحمراء کی کنجیاں مسیحی حکمراں فرنینڈیز کے حوالے کر رہا تھا، عین اسی سال سکندر لودی اپنی سلطنت کی توسیع کے لیے جونپور کے علاقہ پر لشکر کشی کرنے میں مشغول تھا۔

علمی ترقی کا کام ہمیشہ حکومتوں کی سرپرستی اور تعاون سے ہوتا ہے۔ اسپین کی مسلم سلطنت کی سرپرستی میں علمی ترقی کا کام بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا تھا۔ جب یہ سلطنت کمزور ہوئی تو وہاں کے علماء اسپین کو چھوڑ کر یورپ کے دوسرے ملکوں (اٹلی، فرانس، وغیرہ) جانے لگے۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے یورپ کو تاریک دور سے نکال کر جدید ترقی کے دور میں پہنچانے کا ابتدائی کام کیا۔ اگر دہلی کی مسلم سلطنت یا اس زمانہ کی دوسری مسلم سلطنتیں اسپین کے علماء کی سرپرستی کرتیں تو یقیناً یہ لوگ مسلم اسپین سے نکل کر دوبارہ کسی مسلم خطہ میں آجاتے اور یہاں اپنے ترقیاتی کام کی تکمیل کرتے۔ مگر اس زمانہ کی مسلم سلطنتوں کی واحد دلچسپی سیاسی توسیع سے تھی، اس لیے علمی توسیع کے لیے موافق زمین فراہم کرنے میں بھی وہ ناکام رہے۔

دہلی ہندستان کا تیسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کا رقبہ ۱۴۸۵ مربع کیلومیٹر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی صدی قبل مسیح میں موریہ راجہ ڈھلو کے نام پر اس کا نام دہلی رکھا گیا۔ عام خیال ہے کہ دہلی سات بار اجڑی اور سات بار آباد ہوئی۔ مگر کچھ محققین کہتے ہیں کہ پندرہ بار ایسا ہوا۔ دہلی کا قدیم ترین حوالہ مہابھارت میں پایا جاتا ہے۔ اس وقت اس کا نام اندرپرستھا تھا۔ یہ ۱۴۰۰ قبل مسیح کی بات ہے۔

مختلف بادشاہوں نے بار بار دہلی کو تاراج کیا ہے۔ تیمور ۱۳۹۸ء میں اپنی وحشی فوجوں کو لے کر دہلی میں داخل ہوا۔ اور تقریباً پورے شہر کو تباہ کر ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہی دن میں اس نے پچاس ہزار آدمی قتل کروا دیے۔

تیمور (۱۳۳۶ - ۱۴۰۵) ابتداءً ایک معمولی سردار تھا۔ اس کے بعد اس نے دنیا کی ایک عظیم سلطنت قائم کی۔ اس نے منگولیا سے لے کر میڈیٹرینین تک کا وسیع علاقہ فتح کر ڈالا۔ مگر ۷۰ سال سے بھی کم عمر میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹوں اور پوتوں میں جانشینی کا جھگڑا کھڑا ہو گیا جس کے نتیجہ میں اس کی وسیع سلطنت دوبارہ سکڑ کر سمرقند کے علاقہ تک محدود ہو گئی۔

تیمور اپنے کو مسلمان کہتا تھا۔ وہ بے حد بہادر مگر مکمل طور پر جاہل تھا۔ اس نے محض فوجی طاقت کے بل پر ایک ایسا ایمپائر قائم کرنے کی کوشش کی جو اس کے مرتے ہی ختم ہو گیا۔ مزید یہ کہ اس فرضی ایمپائر کو قائم کرنے کے جنون میں اس نے ۱۴۰۲ میں سلطان بایزید کی یورپ کی جانب پیش قدمی کو روک دیا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی (تفصیل کے لیے: عظمتِ اسلام صفحہ ۲۷۶-۲۷۷)

ہم لوگ دہلی سے ہریانہ جانے والی سڑک پر چل رہے تھے۔ راستہ میں ایک جگہ ٹرک کے کنارے ٹرک الٹا ہوا نظر آیا۔ وہ وسیع شاہراہ پر تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ ایک مقام پر ڈرائیور کی غلطی سے اس کا بہیہ سڑک کے نیچے چلا گیا۔ اور پھر اچانک وہ الٹ گیا۔ اس کا سفر معطل ہو کر رہ گیا۔

میں نے سوچا کہ ایسا ہی کچھ معاملہ مسلمانوں کا ہے۔ مسلمان زندگی کی شاہراہ پر تیزی سے رواں دواں تھے کہ ان کے نااہل لیڈروں کی غلطی سے ان کی گاڑی الٹ گئی۔ ٹرک کے لیے جو حیثیت ڈرائیور کی ہے، ٹھیک وہی حیثیت کسی انسانی قافلہ کے لیے لیڈر کی ہوتی ہے۔ لیڈر اگر اہل ہے تو وہ گاڑی کو آگے لے جائے گا۔ اور لیڈر اگر نااہل ہے تو وہ پوری گاڑی کو خندق میں گرا دے گا۔

دہلی کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہم اس علاقہ میں داخل ہوئے جس کو مہرولی کہا جاتا ہے۔ اسی علاقہ میں قطب مینار واقع ہے جو اپنی نمایاں بلندی کی وجہ سے بہت دور تک مسافر کا تعاقب کرتا ہے۔ ایک طرف وہ ماضی کی عظمت کا نشان ہے اور دوسری طرف دنیا کی بے ثباتی کا نشان بھی۔

قطب مینار کو تیرھویں صدی کے آغاز میں قطب الدین ایبک نے بنوایا تھا۔ اس کی بابت

تاریخ میں یہ الفاظ درج ہیں کہ ——— دہلی کا قطب مینار ابھی تک قطب الدین ایبک کی فتوحات کی یاد دلاتا ہے :

The Qutub Minar in Delhi still stands to commemorate his victories. (VII/362)

معز الدین محمد (غور) کو ہندستان میں مسلم سلطنت کے بانیوں میں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ۱۲۰۶ء میں اس کو اس کے حریفوں نے قتل کر دیا۔ اگرچہ یہ واضح نہیں کہ اس کو قتل کرنے والے ہندو تھے یا مسلمان۔ قطب الدین ایک غلام تھا جو محمد غوری کے یہاں ملازمت میں آیا۔ ابتداءً وہ اصطبل کے کام میں تھا۔ پھر ترقی کر کے فوجی افسر بنا اور بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ ۱۱۹۳ء میں پرتھوی راج کو شکست دے کر اس نے دہلی پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد اس نے فتح کے نشان کے طور پر یہاں ایک اونچا مینار بنایا جو اس کے نام پر قطب مینار کہا جانے لگا۔

سلطان معز الدین محمد غور کے قتل (۱۲۰۶ء) کے بعد قطب الدین کو سلطان کا درجہ حاصل ہو گیا۔ تاہم وہ زیادہ دنوں تک حکومت نہ کر سکا۔ گھوڑوں کے ایک کھیل میں وہ شدید طور پر زخمی ہو گیا۔ اسی میں ۱۲۱۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

آٹھ سو سال پہلے جب عظیم قطب مینار بنایا گیا، اس وقت وہ فتح کا نشان تھا۔ مگر آج وہ صرف عبرت کا نشان ہے۔ اب اس کی حیثیت صرف تاریخی علامت کی ہے نہ کہ زندہ حقیقت کی۔

ترقی یافتہ ملکوں میں تاریخی عمارتوں کی دیکھ بھال کا نہایت خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ انڈیا میں اکثر تاریخی عمارتیں غفلت کا شکار ہو رہی ہیں۔ انھیں میں سے ایک قطب مینار بھی ہے۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے باقاعدہ پریس میں اپنی یہ شکایت دی ہے کہ قطب مینار کے باہر لال کوٹھی باؤنڈری کے پاس بہت سے مکانات ناجائز طور پر بنا لیے گئے ہیں۔ بار بار کی شکایت کے باوجود پولیس اس معاملہ میں کچھ نہیں کر رہی ہے۔ آرکیالوجی کے کارکن جب جب ان تعمیرات کو ہٹانا چاہتے ہیں تو اس کے مالکان فوراً عدالت میں جا کر وہاں سے اس کے خلاف امتناعی حکم اسٹے حاصل کر لیتے ہیں۔ جبکہ قانون کے مطابق، باؤنڈری وال کے بعد ۲۳۰ میٹر تک کا علاقہ ممنوعہ علاقہ ہے۔ اور اس کے اندر اس قسم کی کوئی تعمیر نہیں کی جا سکتی :

According to ASI sources, over the last decade a number of houses have sprung up outside the monument's Lal Kothi boundary wall facing Mehrauli within the 230 metres area of what is known as the 'archaelogical cordon.' The first 30 metres from the boundary wall is a prohibited are, the next 100 metres are restricted area and the rest 100 metres are regulated area. Officials said there should be no encroachment in this area.

گاڑی جب دہلی کے شہری حدود سے باہر پہنچی تو سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے فارم ہاؤس دکھائی دینے لگے۔ یہ علاقہ دہلی اور گوڑگاؤں کے درمیان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہندستان کا سب سے زیادہ مہنگا علاقہ ہے۔ یہاں صرف وہی خوش قسمت لوگ رہ سکتے ہیں جو کم از کم کروڑپتی ہوں۔

اس سے پہلے میں اس علاقہ میں چند بار آیا ہوں۔ یہ فارم ہاؤس دہلی کے کثافتی صحرا میں نخلستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر آدمی بیک وقت فطرت کے ماحول میں بھی آجاتا ہے اور سکون کے ماحول میں بھی۔ مگر اس قسم کی پرسکون زندگی صرف وہی لوگ پسند کرتے ہیں جو یا تو ریٹائرڈ

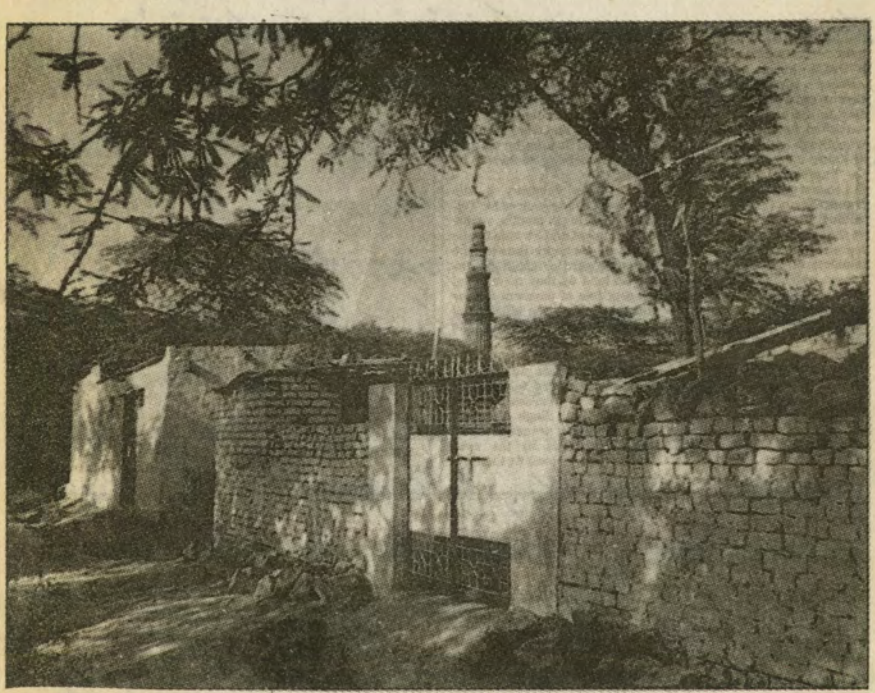

Encroachments near Qutab Minar complex. The picture shows a concrete building in the Qutab complex

وں۔ یا جن کے پاس کرنے کا کوئی کام نہ ہو۔ جو کام والے لوگ ہیں وہ کبھی اس پر عیش تنہائی
یں رہنا پسند نہیں کر سکتے۔

اس علاقہ کے کئی فارم ہاؤسوں میں کسی میٹنگ یا فنکشن کے تحت مجھے بلایا گیا ہے۔ مگر ہر بار
مجھے یہ تجربہ ہوا کہ داخل ہونے کے بعد کچھ لمحہ تک تو یہاں بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کچھ دیر کے
عد ہی حبس کی سی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ یہاں میرے لیے آرام تھا مگر یہاں میرے
یلے کام نہیں تھا۔ اور انسان صرف آرام میں دیر تک مطمئن نہیں رہ سکتا۔ انسان کے مستقل سکون
کے لیے اس کی پسند کا کام ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔

پون گھنٹہ بذریعہ روڈ سفر کرنے کے بعد ہم لوگ گوڑ گاؤں کے مضافاتی علاقہ (قطب انکلیو)
ں داخل ہوئے۔ یہاں جسٹس دیبی سنگھ تیوتیا کی وسیع رہائش گاہ (Tel. 0124-8-350797) پر
یٹنگ کا انتظام کیا گیا تھا۔

جسٹس تیوتیا ایک جاٹ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جاٹ اور میو (مسلمان) ہریانہ کے
لاقہ میں صدیوں سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ مگر دونوں کے مزاج میں حیرت انگیز طور پر نمایاں
رق پایا جاتا ہے۔ جاٹ برادری کا مزاج کیا ہے، اس کو ایک میو کہاوت میں غالباً طنزیہ طور پر اس
رح بیان کیا گیا ہے :

جاٹ کہے سن جاٹنی یائی گاؤں میں رہنا اونٹ بلیا لے گئی ہاں جی ہاں جی کہنا

میو لوگ اس کو فخر سمجھتے تھے کہ وہ کسی حکمراں کی اطاعت قبول نہ کریں۔ چنانچہ وہ دہلی کی ہر
لطنت سے لڑتے رہے، مسلم عہد میں بھی اور انگریزی عہد میں بھی۔ اپنی اس روش کی انھیں
ہایت سخت سزا بھگتنی پڑی۔

مثلاً ۱۲۶۰ء میں انھوں نے بلبن کی شاہی فوج کے اونٹ لوٹ لیے۔ بلبن اس خبر کو سن
ہ نہایت غصہ ہوا۔ وہ دہلی سے روانہ ہو کر میوات کے علاقہ میں پہنچا۔ جہاں اس نے ۲۰ دن تک
تل و غارت گری جاری رکھی۔ بہت سے میو شارع عام پر بری طرح قتل کر دیے گئے۔ ان میں
سے کچھ کو ہاتھیوں سے کچلوایا گیا۔ کچھ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ تقریباً سو میوؤں کی زندہ
کھال کھنچوائی گئی۔ مگر میوؤں کی باغیانہ روش ختم نہ ہو سکی۔ انھوں نے دوبارہ بدامنی شروع کر دی۔

بلبن دوبارہ اپنی فوج کے ساتھ اس علاقہ میں آیا اور میوؤں کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ اور تقریباً بارہ ہزار مردوں اور عورتوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ (تاریخ میوچھتری، از مولانا حکیم عبدالشکور صاحب، صفحہ ۳۳۲-۳۳۳)

میوؤں کے اس مزاج کا انھیں یہ نقصان اٹھانا پڑا کہ ان کی ترقی رک گئی۔ جب کہ اسی علاقہ میں دوسرے لوگ ترقی کرتے رہے۔ یہ صرف پچھلے ۲۰ برسوں کی بات ہے کہ میوؤں نے بھی کچھ ترقی شروع کی ہے اور یہ اس وقت ہوا جب کہ انھوں نے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر موافقت کا طریقہ اختیار کیا۔ تاہم یہ تبدیلی ابھی تک کچھ افراد کی سطح پر ہے نہ کہ پوری میو قوم کی سطح پر۔

اس سے پہلے ۲۲ فروری ۱۹۹۳ کو میں اس علاقہ میں آیا تھا۔ مسٹر احمد رشید شروانی نے یہاں ڈی ایل ایف کالونی میں اپنا ایک گھر بنایا ہے۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک کلب ہے۔ اس میں دو بڑے بڑے لان ہیں۔ اس لان کے درمیان کلب کی کھلی ہوئی عمارت اس طرح واقع ہے جیسے ایک وسیع ہرے بھرے باغ میں خوب صورت فارم ہاؤس بنا ہوا ہو۔

شروانی صاحب کی دعوت پر میں اور نانا صاحب دیش مکھ اور ڈاکٹر مہیش شرما چند گھنٹے کے لیے یہاں آئے تھے۔ یہاں کے پرسکون ماحول میں شروانی صاحب کے ساتھ دن کا کھانا کھایا گیا۔ پھر ملک کے موجودہ حالات پر باتیں ہوئیں، اس کے بعد ہم لوگ دہلی واپس چلے گئے۔

اس طرح کے کلب اور فارم ہاؤس ہندستان کے وسیع صحرا میں نخلستان کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ پروفیسر ہیرن مکرجی آزادی کے بعد بننے والی پہلی لوک سبھا کے ممبر تھے۔ نئی دہلی میں لوک سبھا کے اجلاس میں شرکت کے بعد جب وہ بذریعہ ٹرین کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو سڑک کے کنارے جھگی جھونپڑی کے مناظر نے انھیں متاثر کیا۔ واپس پہنچ کر انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو خط لکھا کہ جھگیوں میں رہنے والے یہ غریب لوگ اگر ہم سے پوچھیں کہ ہندستان کی آزادی سے ہم کو کیا ملا تو مجھ کو نہیں معلوم کہ ہمارا کیا جواب ہوگا۔

پنڈت جواہر لال نہرو (اس وقت کے وزیر اعظم ہند) نے براہ راست اس کا جواب نہ دیتے ہوئے پروفیسر ہیرن مکرجی کو لکھا کہ تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو:

You are paying the price of being sensitive.

گوڑگاؤں ریاست ہریانہ کا ایڈمنسٹریٹو ہیڈ کوارٹر ہے۔ وہ دہلی اور ریواڑی کے درمیان
قع ہے۔ کسی زمانہ میں وہ ہدایت پور کہا جاتا تھا۔ اب اس کا نام گوڑگاؤں ہے۔ یہ ایک مثال
ہے جو علامتی طور پر بتاتی ہے کہ ہمارا ملک کہاں سے کہاں چلا جا رہا ہے۔

آزادی (۱۹۴۷) کے وقت ہریانہ نام کی کوئی ریاست انڈیا میں موجود نہ تھی۔ وہ یکم نومبر ۱۹۶۶
ہندستان کے نقشہ پر ظہور میں آئی۔ اس سے پہلے یہ علاقہ قدیم پنجاب میں شامل تھا۔ اس کے بعد لسانی
ستوں کے مطالبات شروع ہوئے۔ وہ اتنی شدت پکڑ گئے کہ حکومت کو اس کے آگے جھکنا پڑا۔
نچہ ایک ایکٹ کے مطابق، پنجابی بولنے والا علاقہ پنجاب بن گیا اور ہندی بولنے والا علاقہ ہریانہ
یا۔ پنجاب کے علاقہ میں زیادہ تر سکھ آباد تھے، اور ہریانہ کے علاقہ میں زیادہ تر ہندو۔

ہریانہ کے علاقہ کو ہندو مذہب کی جائے پیدائش سمجھا جاتا ہے۔ کروکشیتر اسی ریاست میں
قع ہے۔ جہاں ہندو روایات کے مطابق، ارجن نے اپنی لڑائی لڑی تھی اور کرشن نے وہ اپدیش
جو بھگوت گیتا کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۵۲۶ء میں پانی پت کی تاریخی لڑائی بھی اسی علاقہ میں ہوئی
ں بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دی تھی۔ وغیرہ

ہریانہ ایک ہندی اسپیکنگ ریاست ہے۔ اس کی پچھمی سرحد دہلی سے ملی ہوئی ہے۔ ۱۹۷۱
ردم شماری کے مطابق، ریاست کی آبادی تقریباً ایک کرور (10,000,000) ہے۔ اس میں
فی صد ہندو، چار فی صد مسلمان اور چھ فی صد سکھ ہیں۔ جین تقریباً ایک فی صد بتائے جاتے ہیں۔
مسلمانوں کا خیال ہے کہ ان کی موجودہ تعداد اس سے کافی زیادہ ہے جتنا ۱۹۷۱ کی مردم شماری میں
یا گیا تھا۔

ہریانہ کے وزیر آبپاشی و پارلیمانی امور مسٹر جگدیش نہرہ نے کناڈا وغیرہ کا سفر کیا تھا۔ اس سلسلہ
انھوں نے اپنا طویل سفرنامہ "میری بدیش یاترا" کے نام سے شائع کیا ہے۔ مجھے اس کی پانچویں قسط
ھنے کا موقع ملا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا:

"شام کے وقت میں اپنے ایک دوست شری کرم ویر راٹھی کے گھر ڈنر پر مدعو تھا شری راٹھی
کناڈا کی شہریت حاصل کر لی ہے۔ اس وقت ان کے گھر پر ڈنر کے لیے ۲۰ - ۳۰ جوڑے مدعو
ے۔ جو کہ مختلف صنعتوں سے وابستہ تھے۔ مجھے وہاں ان سے مفصل بات چیت کرنے کا موقع ملا۔

اور میں نے ان کو کہا کہ آپ بھارت کے ساتھ بیوپار بڑھائیں۔ اور بھارت میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگائیں۔ تاکہ آپ کے فائدہ کے ساتھ ساتھ بھارت کا بھی زیادہ وکاس ہو۔ لگ بھگ وہ سبھی بھارت میں سرمایہ کاری کرنے اور اپنا بیوپار بڑھانے کے لیے متفق تھے۔ لیکن انھوں نے مجھے بتایا کہ بھارت کی افسر شاہی اور انتظامیہ ویوستھا کے کارن ایسا نہیں کر رہے۔ انھوں نے یہ واضح کیا کہ ایڈمنسٹریٹو سطح پر بھارت میں بھرشٹاچار پھیلا ہوا ہے۔ امپورٹ، ایکسپورٹ کے لیے غیر ضروری کارروائیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور بلاوجہ تاخیر ہونے کے کارن ان کے بیوپار پر برا اثر پڑتا ہے۔ انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر ویوستھا میں سدھار لایا جائے تو وہ بخوشی بھارت سے اپنے تجارتی تعلقات بڑھائیں گے میں نے بھی محسوس کیا کہ ان کی یہ بات ٹھیک ہے کاروبار شروع کرانے کا عمل آسان ہونا چاہیے۔ تاکہ بدیشی خود بھارت میں پیسہ لگانے میں نہ ہچکچائیں۔ (ہند سماچار، ۱۳ جون ۱۹۹۵)

ہریانہ کی ریاستی راجدھانی چندی گڑھ میں ہے۔ چندی گڑھ کو ہریانہ اور پنجاب کی مشترک راجدھانی کہا جاتا ہے۔

چندی گڑھ ہندستان کا واحد شہر ہے جو مکمل طور پر منصوبہ بند انداز میں بنایا گیا ہے۔ اس کا نقشہ سوئٹزرلینڈ کے سٹی پلاننگ کے مشہور ماہر لی کاربوزر (Le Corbusier) نے بنایا تھا۔ چندی گڑھ کی تعمیر انگریزی دور میں پنجاب کی راجدھانی کے طور پر ہوئی۔ بعد کو ۱۹۶۶ میں جب زبان کی بنیاد پر پنجاب اور ہریانہ کی تقسیم ہوئی تو نزاع پیدا ہوئی کہ چندی گڑھ کو دونوں میں سے کس کے حصہ میں دیا جائے۔ آخر کار اس نزاع کو اس طرح ختم کیا گیا کہ اس کو دونوں ریاستوں کی مشترک راجدھانی بنا دیا گیا۔ گویا یہاں بھی تقسیم کا فارمولا اپنا کر مسئلہ کو حل کیا گیا۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب انگریزوں نے دہلی کی سلطنت پر قبضہ کرنا چاہا تو سکھوں نے اس مہم میں انگریزوں کی کافی مدد کی تھی۔ اس کی وجہ سکھوں کی وہ ناراضگی تھی جو ان کو مغل حکمرانوں کے بعض سلوک کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔ چنانچہ جب ہندستان پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا تو انھوں نے سکھوں کو بہت زیادہ نوازا۔ پنجاب میں کثرت سے سڑکیں اور نہریں بنائی گئیں۔ وہاں بجلی پہنچائی گئی۔ ان کے لیے چنڈی گڑھ کی صورت میں شاندار راجدھانی کی تعمیر کی گئی۔ وغیرہ۔ تقسیم کے بعد بھی یہ نوازش جاری رہی۔ چنانچہ سکھوں کو نہایت فیاضی کے ساتھ برطانیہ کا ویزا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے

کہ آج سردار لوگ بڑی تعداد میں برطانیہ کے شہروں میں موجود ہیں۔ اور خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

پہلی بار ۱۹۶۰ میں میں نے چندی گڑھ کا سفر کیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر احسان اللہ خاں صاحب چندی گڑھ میں رہتے تھے۔ میرا چند روزہ قیام انھیں کے مکان پر تھا۔ یہ ایک علمی سفر تھا۔ اس کا مقصد نظریۂ ارتقاء کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا تھا۔

ہندستان میں سوالک پہاڑیوں میں قدیم جانوروں کے متحجرات فاسلس برآمد ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر احسان اللہ اس کی کھدائی کے انچارج تھے۔ سوالک پہاڑیاں چندی گڑھ سے بالکل قریب ہیں۔ یہاں پہنچ کر میں ان کے ساتھ سوالک پہاڑیوں میں گیا۔ وہاں متحجرات کا مشاہدہ کیا۔ اس کے علاوہ چندی گڑھ میں واقع نیچرل ہسٹری میوزیم کو تفصیل کے ساتھ دیکھا۔ نیز یہاں کی لائبریری میں ارتقاء سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ اس مشاہدہ اور مطالعہ کے بعد میں نے وہ مضمون لکھا جو نظریۂ ارتقاء کے نام سے ماہنامہ زندگی (رامپور) کے شمارہ ذوقعدہ ۱۳۸۰ھ میں شائع کیا گیا۔

الجمعیۃ ویکلی کی ادارت (۷۴-۱۹۶۷) کے زمانہ میں میں نے میوات (ہریانہ، راجستھان) کے تقریباً ۲۰ سفر کیے تھے۔ ان اسفار میں اس علاقہ کے گاؤں گاؤں میں گیا تھا۔ ان سفروں کی روداد اولاً الجمعیۃ ویکلی میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۸۸ میں ان کا مجموعہ "میوات کا سفر" کے نام سے شائع کیا گیا۔

اس دوران پہلی بار میں ۱۹۶۹ میں گوڑگاؤں آیا تھا۔ اس وقت میوات کے مشہور لیڈر چودھری یٰسین خان زندہ تھے۔ اگرچہ اب وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ میوات کا سفر نامی کتاب میں ان سے پہلی ملاقات کی روداد اس طرح درج ہے:

"ہمارے سفر کی پہلی منزل گوڑگاؤں تھی۔ یکم اگست ۱۹۶۹ کی صبح کو جب کہ رکشا مجھ کو اور مولانا عبد الرحیم بڈیڈوی کو چودھری محمد یٰسین صاحب کی قیام گاہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ ہماری باتوں کو سن کر رکشے والا اچانک بولا ——— "چودھر یٰسین ... ان کا حال تو یہ ہے کہ رات کو اٹھ کر تنہا جنگل چلے جاتے ہیں اور بھگوان کی دیا ان پر ایسی ہے کہ شیر ان کے تلوے چاٹتا ہے۔"

ہم لوگ چودھری یٰسین کے کمرہ میں پہنچے تو وہ بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے صاحب فراش ہو چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ شخص جو کبھی میوات کا شیر کہا جاتا تھا، وہ اب نڈھال ہو کر بستر پر پڑ گیا ہے۔ ان کی نقاہت کو دیکھ کر میں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کیا ہوگی۔ انھوں نے جواب دیا: صورت ببیں حالم مپرس۔

میں نے بتکرار کہا کہ کچھ اپنے تجربات بتائیے۔ مگر وہ کچھ بول نہ سکے۔ ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں انھوں نے سخت مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کے نزدیک ان مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرنا گویا مردہ شخص کو طاقت کا انجکشن لگانا ہے۔ (صفحہ ۴۴)

گوڑگاؤں کی اس میٹنگ کا موضوع یہ تھا کہ کیا ملک کو سیاسی متبادل (Political alternative) مہیا کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں نے اپنے اپنے خیالات پیش کیے۔

میں نے کہا کہ یہی بھارتیہ جنتا پارٹی کا نعرہ بھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کانگرس کا سیکولرزم سوڈو سیکولرزم ہے۔ اور وہ خود ہندتو کی شکل میں اس کا متبادل پیش کرنا چاہتی ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو سوڈو سیکولرزم کا متبادل ہندتو نہیں ہے۔ سوڈو سیکولرزم کا متبادل سچا سیکولرزم ہے۔ اس معاملہ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ فی الواقع اس معاملہ میں سنجیدہ ہیں تو فی الحال اپنی ساری طاقت ہریانہ اسٹیٹ پر خرچ کیجئے۔ یہاں آپ ایک ایسا سسٹم بنائیے جہاں کسی درجہ میں ایسا ہو کہ دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہو۔ عدالتوں میں انصاف خریدے بغیر انصاف مل جائے۔ ہر نوجوان کو تعلیم کی سہولت حاصل ہو جائے۔ ریاست میں امن وامان کی حالت قائم ہو جائے۔ اگر ایک ریاست میں یہ باتیں قابل ذکر درجہ میں وجود میں آجائیں تو سارے دیش پر اس کا اثر پڑے گا اور پھر وہ وقت آئے گا جب کہ ہم ایک نئے ہندستان کی تعمیر میں کامیاب ہو جائیں۔

یہ میٹنگ اصلاً سیاسی موضوع پر بات چیت کے لیے بلائی گئی تھی۔ تاہم دوران گفتگو بہت سی دوسری باتیں بھی سامنے آئیں۔ جسٹس دیبی سنگھ تیوتیا نے کہا کہ ہر آدمی کو سچائی کا پتہ ہے، مگر کوئی ترغیب (temptation) آدمی کو پاگل کر دیتی ہے۔ میں نے کہا کہ اس بات کو ایک عربی مقولہ میں اس طرح کہا گیا ہے کہ کسی چیز کی محبت تم کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (حبّك الشيئ يعمى ويصم)

جن ستہ پارٹی کے سکریٹری اپنی ایک بات کہتے ہوئے بار بار "حضرت صاحب" کا لفظ بولتے تھے۔ پہلے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ حضرت صاحب سے کیا مراد ہے۔ مگر جب انھوں نے مکہ، مدینہ کا نام لیا اور کچھ واقعات کے حوالے دیے تو معلوم ہوا کہ اس سے ان کی مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہے۔

میں نے اکثر پایا ہے کہ پڑھے لکھے ہندوؤں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت احترام پایا جاتا ہے۔ ایک مجلس میں ایک بار ایک صاحب نے کہہ دیا کہ اسلام علم سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے ہو گئے ہیں۔ اس مجلس میں مشہور قانون داں مسٹر رام جیٹھ ملانی بھی موجود تھے۔ انھوں نے فوراً تردید کی۔ اور کہا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ علم کی اہمیت پر تو پیغمبر اسلام کا ایک ایسا قول ہے جو آپ کو کسی کے یہاں بھی نہیں ملے گا۔ آپ نے فرمایا کہ عالم کے قلم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔

آج (۱۹ مئی) کے انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس میں میرا ایک مضمون چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا ——— ہندستان کی تعمیر نو :

Towards a new India

اکثر لوگ اس مضمون کو آج صبح پڑھ چکے تھے۔ چنانچہ اپنے آپ وہ گفتگو کا موضوع بن گیا۔ سبھی لوگوں نے اس کو پسند کیا اور اس کے نکات سے اتفاق کیا۔

ایک صاحب نے الکشن کے ذریعہ پولیٹکل چینج کی حمایت میں تقریر کی۔ میں نے ان کے جواب میں جیمز فری مین کلارک (James Freeman Clarke) کا یہ قول دہرایا کہ سیاست داں اور مدبر میں یہ فرق ہے کہ سیاست داں اگلے الکشن کے لیے سوچتا ہے۔ اور مدبر اگلی نسل کے لیے سوچتا ہے :

The difference between a politician and a statesman is: a politician thinks of the next election, and a statesman thinks of the next generation.

میں نے کہا کہ جو لوگ محض الکشن جیتنے کے مقصد سے سیاست کے میدان میں آتے ہیں وہ قوم کو زبردست نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کے سامنے صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ الکشن میں لوگوں کا ووٹ حاصل کر لیں۔ اس لیے وہ عوام کو بھڑکاتے ہیں۔ وہ عوام کے جذبات کا استحصال کرتے ہیں۔ وہ الکشن کے مفاد کے لیے قومی مفاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ الکشن یا وقتی سیاسی مفاد کے لیے ہر پارٹی نے یہ کیا کہ اسکول اور کالج کے لڑکوں کو کلاس سے باہر لے آئی۔ اس طرح اسکولوں اور کالجوں میں تعلیمی روایات ٹوٹ گئیں۔ طلبہ تعلیمی سرگرمیوں کے بجائے وقتی سیاست کے ہنگاموں میں شریک ہونے لگے۔ پڑھائی

میں محنت کرنے کے بجائے وہ سیاسی نوعیت کے کاموں میں دل چسپی لینے لگے۔ یہی خاص وجہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں تعلیمی معیار کو پست کر دیا ہے۔ حالاں کہ پہلے ایسا نہ تھا۔

گوڑگاؤں کی اس میٹنگ میں ایک عجیب بات میں نے یہ دیکھی کہ اکثر ہندو اپنی گفتگو کے دوران اقبال کا کوئی شعر پڑھتے تھے۔ ہر ایک کے اندر میں نے اقبال کے لیے خاص احترام پایا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ خود پنڈت جواہر لال نہرو اپنی تقریروں میں اقبال کا یہ شعر بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے :

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے　　باقی مگر ہے اب تک نام و نشاں ہمارا

میں نے سوچا کہ جب ہندوؤں کے دل میں اقبال کے لیے اتنا عزت و احترام تھا تو انھوں نے ہندوؤں سے کٹ کر علاحدہ مسلم اسٹیٹ بنانے کی تجویز کیوں پیش کی جس نے بالآخر پاکستان کی صورت اختیار کی۔ ایسی حالت میں تو چاہیے تھا کہ اقبال ہندوؤں کے ساتھ میل جول پر زور دیں اور ہندوؤں کے درمیان سفیرِ اسلام کا کردار ادا کریں۔

حال میں ایک جلسہ میں میری ملاقات مسٹر کے آر ملکانی سے ہوئی جو بھارتیہ جنتا پارٹی کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ میں نے کہا کہ مسٹر جناح ملک کے بٹوارہ کے ذمہ دار تھے۔ مگر ہندوؤں سے بات چیت کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ہندوؤں کو مسٹر جناح سے کوئی نفرت نہیں۔ حتی کہ بھارتیہ جنتا پارٹی والوں کو بھی نہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔ مسٹر ملکانی نے جواب دیا : جناح کے خیالات جو بھی ہوں، مگر وہ ایک دم دار آدمی تو تھا۔

جن لوگوں کے درمیان اسلام اور مسلمانوں کے لیے اس طرح نرم گوشہ موجود ہو، ان سے کٹ کر الگ ملک بنانا سراسر ایک غیر دانش مندانہ بات تھی۔ ایسے لوگوں کے درمیان کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ یہ کہ غیر ضروری طور پر ان سے قطع تعلق کر لیا جائے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آج کا مسئلہ اعتماد کے بحران (Crisis of credibility) کا مسئلہ ہے۔ اعتماد بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے ایک آدمی اچھی بات کہتا ہے تو کوئی اس پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف کہنے کے لیے ہے، کرنے کے لیے نہیں ہے۔

ایک صاحب جن کا تعلق جاٹ برادری سے تھا، انھوں نے کہا کہ جاٹ عام طور پر سیدھے

ہوتے ہیں۔ جانوں کو کوئی بھڑکائے نہیں تو وہ ٹھیک ہی راستہ پر چلیں گے۔ میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ جانوں کی فطرت ابھی بگڑی نہیں ہے۔ اس لیے وہ ایسے ہیں۔ ہر آدمی ابتداءً فطرت ہی پر ہوتا ہے۔ اور فطرت ہمیشہ صحیح رہنمائی کرتی ہے۔ آدمی کو اگر اس کی پیدائشی فطرت پر رہنے دیا جائے تو وہ کبھی بگاڑ میں مبتلا نہیں ہوگا۔

ایک معمر ہندو نے کہا کہ لوگ خواہ مخواہ اورنگ زیب کو برا کہتے ہیں۔ اورنگ زیب سے اچھا تو کوئی رولر نہیں۔ وہ بے حد سادہ تھا اور اپنے ذاتی خرچ کے لیے وہ سرکاری خزانہ سے کچھ نہیں لیتا تھا۔ بلکہ ٹوپیاں سی کر اس سے اپنا کام چلاتا تھا۔

ایک صاحب نے کہا کہ "میں محمڈن کو ہندوؤں سے الگ تو مانتا ہی نہیں۔ آپ قرآن کو لیجئے اور اپنشد کو لیجئے۔ دونوں کو پڑھتے جائیے۔ کہیں کوئی فرق ملے گا ہی نہیں۔

ایک صاحب نے ٹی این سیشن کی تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ آج دیہات کا آدمی بھی صبح اٹھ کر پوچھتا ہے کہ سیشن نے آج کیا کہا۔ میں نے کہا کہ یہ ایک منفی مقبولیت ہے۔ سیشن چوں کہ اتھارٹی کے خلاف بولتے ہیں اس لیے وہ ہیرو بنے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ساری دنیا میں لوگ اتھارٹی کے خلاف تقریریں کر کے ہیرو بن جاتے ہیں۔ مگر اس قسم کی مقبولیت کی کوئی مثبت افادیت نہیں۔

یہاں تقریباً سبھی لوگ بھارتیہ جنتا پارٹی پر تنقید کر رہے تھے۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو نے بتایا کہ میری بات چیت ان کے ایک بڑے لیڈر سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ہندو دھرم کی سروس نہیں کر رہے ہیں، بلکہ آپ لوگ اس کی ڈِس سروس کر رہے ہیں۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ پورے ملک کی سطح پر دیکھا جائے تو ہندوؤں کی اکثریت بھارتیہ جنتا پارٹی کو پسند نہیں کرتی۔

اس کا ایک عمومی مظاہرہ بعد کو ۱۴ مئی ۱۹۹۶ کو ہوا۔ اس دن بھارتیہ جنتا پارٹی کی مرکزی حکومت پر پارلیمنٹ میں مباحثہ تھا۔ یہ پوری کارروائی عین اسی وقت ٹی وی پر آ رہی تھی جس کو سارا ملک دیکھ رہا تھا۔ جن لوگوں نے پارلیمنٹ کے اس اجلاس کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ تقریباً تمام ممبران بھارتیہ جنتا پارٹی کے خلاف بول رہے تھے۔ اور دو ہفتہ کے وزیر اعظم شری اٹل بہاری باجپئی جواب دینے سے عاجز ہو رہے تھے۔ پارلیمنٹ میں جب ان کو حمایت نہ مل سکی تو ایک خاتون ممبر نے اپنی تقریر میں کہا:

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

جسٹس دیبی سنگھ تو تیا نے بتایا کہ لاہور کے لا کالج نے اپنی ایک تقریب میں مجھے اولڈ بوائے کی حیثیت سے بلایا تھا۔ وہاں میں ہوٹل میں ٹھہرنے کے بجائے ایک پاکستانی وکیل کے یہاں ٹھہرا۔ اس مسلم وکیل کے پورے خاندان نے میرے ساتھ جس طرح عزت اور محبت کا برتاؤ کیا وہ اتنا زیادہ تھا کہ اس سے زیادہ میں سوچ نہیں سکتا۔

میں نے کہا کہ اگر آپ پاکستان کے اخبارات پڑھیں، یا پاکستان کا ٹی وی دیکھیں اور وہاں کا ریڈیو سنیں تو آپ پائیں گے کہ وہاں کا پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا رات دن ہندستان کے خلاف نفرت کی باتیں پھیلا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات بتاتے ہیں کہ میڈیا خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو، اس کی ایک حد ہے۔ اس حد پر جاکر میڈیا کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ حد خود انسان کی فطرت ہے۔ میڈیا کے تمام تر پروپگنڈے کے باوجود انسان کی فطرت پھر بھی زندہ رہتی ہے۔ کوئی بھی خارجی چیز ان کی فطرت کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔

مسٹر سوراجیہ سنگھ گوڑگاؤں ضلع کے رہنے والے ہیں۔ وہ ایک تنظیم سے جڑے ہوئے ہیں جو بندھوا مزدور کے خلاف تحریک چلا رہی ہے۔ چار سال پہلے وہ ہریانہ کے ایک مقام پر گئے جہاں ایک سو کے قریب بندھوا مزدور تھے۔ انھوں نے ان کو رہا کرانے کی کوشش شروع کی۔ مگر مالکوں نے انھیں اتنا مارا کہ ان کے دونوں پاؤں ٹوٹ گئے۔ اس کے بعد وہ کئی مہینہ تک اسپتال میں پڑے رہے۔

بندھوا مزدور خاتمہ قانون (Bonded Labour System (abolition) Act 1976) تقریباً ۲۰ سال پہلے پاس کیا گیا تھا۔ پچھلے سال گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ ہم نے سوا دو لاکھ بندھوا مزدور رہا کرائے ہیں اور اب یہ سماجی برائی ملک میں بہت کم ہو گئی ہے۔ ہریانہ گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ ریاست میں بندھوا مزدور سسٹم کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

مگر مسٹر سوراجیہ سنگھ نے بتایا کہ یہ سب پروپگنڈے کی باتیں ہیں۔ ان کے اندازہ کے مطابق ابھی بھی ملک میں ۵۰ لاکھ بندھوا مزدور موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ابھی حال میں ہم نے ہریانہ کے ایک مقام سے ۴۷ بندھوا مزدور رہا کرائے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قانون میں درج ہے کہ جہاں کہیں بھی بندھوا مزدور بنانے کے الزام میں کوئی شخص پکڑا جائے تو سمری ٹرائل کر کے اس کا فوراً فیصلہ

کیا جائے اور ملزم کو کڑی سزا دی جائے۔ مگر آج تک کسی ایک شخص کو بھی سزا نہیں دی گئی۔ ایسی حالت میں بندھوا مزدور بنانے کا نظام کیسے ختم ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ صرف بندھوا مزدور کی بات نہیں ہے۔ ہر معاملہ میں آج یہی حالت ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ قوانین کی کثرت کے باوجود ابھی تک جرائم پر کنٹرول نہ کیا جا سکا۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ میجر محمد عثمان (ریٹائرڈ) کے ساتھ گوڑگاؤں کی جامع مسجد میں جا کر جمعہ کی نماز ادا کی۔ اس مسجد کے امام حافظ جان محمد ہیں۔ وہ آٹھ سال سے یہاں امامت کر رہے ہیں۔ مسجد کے منتظم جناب ولی محمد ایڈووکیٹ ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرے باپ کا نام بھوپت تھا۔ میرے دادا کا نام مُرلی تھا۔ یہ لوگ مسلمان تھے۔ میوات میں پہلے اسی طرح نام رکھے جاتے تھے۔ ابھی بھی میوؤں کے کلچر پر پڑوسی قوموں کی گہری چھاپ ہے۔ مثلاً قریب کے رشتوں میں نکاح نہ کرنے کا رواج انھیں غیر مسلموں سے میوؤں میں آیا ہے۔

راستہ میں میجر عثمان صاحب (۶۳ سال) نے بتایا کہ وہ ۱۹۴۹ میں فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ سروس کے زمانہ کا کوئی تجربہ بتائیے۔ انھوں نے بتایا کہ میرے ساتھ پندرہ سو جوان ٹریننگ کے لیے بنگلور بھیجے گئے۔ یہ سب تقسیم کے زخم خوردہ تھے۔ شروع شروع میں ہر ایک شکایت کرتا تھا۔ ہر ایک دوسرے کے خلاف بولتا تھا۔ مگر چھ مہینہ ایک ساتھ رہنے کے بعد ہندو مسلم سب ایک ہو گئے۔ پہلے ہم اپنے کو مسلمان، ہندو، سکھ سمجھتے تھے۔ اب ہم ایک دوسرے کو صرف انڈین سمجھنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ اختلاط سے اور مل جل کر رہنے سے سارا جھگڑا ختم ہو سکتا ہے۔ دوری غلط فہمیاں پیدا کرتی ہے، قربت غلط فہمیوں کو ختم کر دیتی ہے۔

میجر عثمان صاحب نے ریٹائر ہونے کے بعد کام تلاش کرنے کی کوشش کی۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کی مرضی کا کام ملنا مشکل ہے۔ انھوں نے اس کا خیال چھوڑ دیا۔ اور اپنے لیے ایک اور مشغولیت تلاش کر لی۔ گوڑگاؤں میں دو ایکڑ زمین پر انھوں نے ایک اسکول کھول دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کو وہ نمونہ کا اسکول بنائیں۔ یہ اسکول ہمارے راستہ میں سڑک کے کنارے تھا۔ چنانچہ چند منٹ کے لیے گاڑی روک کر ان کا اسکول دیکھا۔ فی الحال یہ اسکول ایک عارضی عمارت میں ہے۔ مگر مشکلات کے باوجود

میجر عثمان صاحب کے حوصلے بلند ہیں۔ اور بلاشبہ اس دنیا میں کامیابی کے لیے سب سے بڑی چیز حوصلہ ہے۔

گوڑگاؤں کی جامع مسجد پہنچے تو وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ شہر کے علاوہ اطراف کے لوگ بھی موجود تھے۔ نماز سے پہلے تقریباً آدھ گھنٹہ کی ایک تقریر کی۔ تقریر میں میں نے المساجد بیوت المتقین (حدیث) کو موضوع بنایا۔

میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد تقویٰ کی تربیت کا مرکز ہے۔ اس کے بعد مسجد اور نماز اور عبادت کی تشریح کی اور بتایا کہ تقویٰ دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیوں کا زینہ ہے۔ اگر لوگوں میں تقویٰ کی صفات آجائیں تو وہ اہل دنیا کے لیے محبوب بن جائیں گے اور پھر آخرت میں جنت کے مستحق قرار پائیں گے۔

نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لیے امام صاحب کے کمرہ میں نشست ہوئی۔ یہاں ولی محمد صاحب ایڈووکیٹ اور دوسرے صاحبان سے مختصر گفتگو ہوئی۔

مسجد سے باہر نکلا تو ایک بڑا کئی منزلہ مکان سامنے تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: "یاسین پلازا" لوگوں نے بتایا کہ یہ چودھری یٰسین صاحب کا مکان تھا۔ اس کو ان کے صاحبزادے چودھری طیب حسین نے ازسرِنو بنوایا ہے۔ اس کی پانچ منزلیں ہیں۔ اوپر ان کی رہائش گاہ ہے۔ نیچے کے تمام حصے مارکٹ بنا دیے گئے ہیں۔

پہلی بار جب میں گوڑگاؤں آیا تھا تو اسی مکان میں چودھری یٰسین صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ صاحب فراش ہو چکے تھے۔ جہاں تک یاد ہے، یہ قدیم وضع کا ایک خستہ مکان تھا۔ مگر اسی جگہ آج شاندار کئی منزلہ عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ علامتی طور پر یہ اس ملک میں مسلمانانِ ہند کی حالت کا نشان ہے۔ ۱۹۴۷ کی تقسیم کے وقت مسلمان جس معاشی حالت میں تھے اس سے آج وہ بہت زیادہ آگے جا چکے ہیں۔ اس پر ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ایک صاحب نے گوڑگاؤں کی ایک ماڈرن مسلم فیملی کا قصہ بتایا۔ یہ لوگ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے گھر میں انگریزی زبان ہی لکھی اور بولی جاتی ہے۔ ان کے لڑکے کی شادی ایک سابق گورنر کی لڑکی سے ہوئی۔ یہ لڑکی اگرچہ تعلیم یافتہ تھی، مگر اس کی تعلیم زیادہ تر اردو میں ہوئی تھی اور وہ اردو زبان بولتی تھی۔

یہ بات لڑکے کی انگریزی تعلیم یافتہ ماں کو پسند نہ تھی۔ وہ اکثر کہتی کہ بہو کو انگریزی زبان سیکھنا چاہیے۔ مگر بہو اس معیار کو پورا نہ کر سکی۔ ایک روز ماں نے غصہ ہو کر بہو کے بارہ میں کہا کہ آخر وہ کب انگریزی طریقہ اختیار کرے گی :

When she will become anglicised?

یہ قصہ میں نے سنا تو میں نے کہا کہ اس کے برعکس اگر ایسا ہوتا کہ مذکورہ مسلم خاندان ہندی داں خاندان ہوتا جیسا کہ آج کل اکثر جگہ ہو رہا ہے اور وہاں ایسی بہو آتی جو انگلش اسکول کی پڑھی ہوئی ہوتی اور انگریزی زبان بولتی تو شاید اس کی ساس ایسا نہ کرتی کہ وہ اس کو ہندی بولنے کی تلقین کرتی۔ اور جب وہ ہندی نہ بولتی تو ساس کہتی کہ یہ بہو آخر کب ہندی طریقہ اختیار کرے گی۔

انگریزی زبان اور ہندی زبان میں اس فرق کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک کے بارہ میں ذہنی مرعوبیت ہے، اور دوسرے کے بارہ میں ذہنی مرعوبیت نہیں۔

نماز جمعہ سے فراغت کے بعد دوبارہ میجر عثمان صاحب کے ساتھ واپسی ہوئی۔ راستہ میں میں نے عثمان صاحب سے پوچھا کہ اپنی سروس کے زمانہ کے کچھ تجربات بتائیے۔ مجھے تعجب ہوا کہ عام رواج کے برعکس انھوں نے نہ تو ہندو تعصب کی بات کی۔ نہ یہ کہا کہ میرا پروموشن نہیں ہونے دیا گیا۔ میں فلاں یونٹ سے ریٹائر ہو سکتا تھا مگر مجھ کو میجر ہی کے درجہ پر باقی رکھا گیا۔ اس قسم کی شکایتی باتیں کرنے کے بجائے انھوں نے کہا کہ میری سروس نے مجھے سب کچھ دیا۔ اس معاملہ میں میرے پاس کلمۂ شکر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

پھر انھوں نے کہا کہ دیکھئے، اسی سروس پر رہ کر میں نے اپنے بچوں کو تعلیم دلائی۔ آج میرے بچے سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ میں ایک میو کا لڑکا تھا۔ مگر اس سروس نے مجھے افسر کے عہدہ پر پہنچا دیا۔ سروس نے مجھے سارا ہندستان دکھا دیا۔ میں گاؤں میں پیدا ہوا مگر اسی سروس کی بدولت آج میں شہر کے اندر اپنے ذاتی مکان میں رہتا ہوں۔ میرے پاس کار اور تمام ضرورت کی چیزیں موجود ہیں۔ مجھے کبھی کسی تعصب کا تجربہ نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا : اگر آپ اپنے کو ٹھیک رکھیں تو تعصب والا اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ میجر عثمان صاحب فرید آباد میں رہتے ہیں، اور ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے (Tel. 8-230291)

نماز کے بعد ہم لوگ جسٹس تیوتیا کی رہائش گاہ پر پہنچے تو دوپہر کا کھانا میز پر رکھا جا چکا تھا۔ تمام شرکار کے ساتھ کھانا کھایا گیا۔ کھانا بالکل سادہ اور میرے مزاج کے عین مطابق تھا۔ کھانے کے بعد دیر تک ملکی موضوعات پر تبادلۂ خیال جاری رہا۔

شام کو گوڑگاؤں سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ اس سفر میں مسٹر مول چند جین ساتھ تھے۔ وہ عرصہ تک عملی سیاست میں رہے ہیں۔ ہریانہ کے منسٹر بھی بنے۔ مگر اب وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں اور کرنال میں مال روڈ پر رہتے ہیں۔

انھوں نے بہت جوش کے ساتھ کہا کہ خرابی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ بس اپنے سے باخبر ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے کو نہیں جانتے۔ مثلاً اسلام میں وحدت کا تصور جتنا کلیر ہے، کسی اور دھرم میں نہیں۔ اسی طرح اسلام میں جو مساوات ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ مگر لوگ بے بنیاد طور پر غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے گنڑوں (خوبیوں) کو جانیں تو سارا اختلاف ختم ہو جائے۔

مسٹر جین اردو جانتے ہیں۔ انھوں نے میٹنگ میں سب کے سامنے یہ بات کہی کہ اسلام میں جو خلیفہ ہوئے ہیں ان سے بڑھ کر اچھے حکمراں کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ ہمارے یہاں راجہ جنک کا نمونہ بتایا جاتا ہے۔ مگر کون جانتا ہے کہ جنک کب تھے، اور تھے بھی یا نہیں۔ وہ کوئی ہسٹاریکل فیگر نہیں۔ مگر اسلامی خلیفہ تو تاریخی شخصیتیں ہیں۔

مغرب کے قریب ہم لوگ دہلی واپس آ گئے۔

دوسرا سفر

مول چند جین ہریانہ کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ وہ ایک فریڈم فائٹر ہیں۔ اس کے علاوہ منسٹر اور ایم پی اور مختلف بڑے عہدوں پر رہ چکے ہیں۔ اب ان کی عمر ۸۰ سال ہو چکی ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۹۵ کو ان کا اکیاسی واں جنم دن تھا۔ اس موقع پر ان کے آبائی گاؤں سکندر پور ماجرا (کرنال) میں ایک عوامی تقریب منائی گئی۔ شری مول چند جین کو چوں کہ لائبریریوں کا بہت شوق ہے اور انھوں نے اپنے آبائی گاؤں سکندر پور ماجرا میں ایک اچھی لائبریری قائم کی ہے۔ اس لیے لوگوں نے طے کیا کہ اس بار مول چند جین کے جنم دن کو لائبریری دن کے طور پر منایا جائے۔ منتظمین کی طرف سے مجھے بھی اس موقع پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ سفر پیش آیا۔

۲۰ اگست ۱۹۹۵ء کی صبح کو جسٹس دیبی سنگھ تیوتیا کے ساتھ روانہ ہوا۔ دہلی کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ہم لال قلعہ کے پاس پہنچے۔ ہماری گاڑی لال قلعہ کی دیواروں کے متوازی چل رہی تھی۔ مجھے ایک شاعر کا شعر یاد آیا جو اس نے اس تاریخی قلعہ کے بارہ میں لکھا تھا :

اے قلعۂ سرخ اے اثر شاہ جہانی　　بربادشدہ عظمت ماضی کی نشانی

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کچھ لوگ لال قلعہ کو عظمت کی نشانی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ مگر میں اس کو عبرت کی نشانی کے طور پر دیکھتا ہوں۔ جمنا کے کنارے بنا ہوا ۵۰ فیٹ اونچی دیواروں والا یہ عظیم قلعہ دریا کے سیلاب سے اپنے مکینوں کو بچا سکتا تھا۔ مگر اس میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ حقائق کے سیلاب سے ان کو بچا سکے۔ حقائق کا سیلاب ہر دوسری چیز سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوتا ہے۔

دہلی سے نکل کر ہم ہریانہ میں داخل ہوئے۔ ہماری گاڑی سڑک پر دھکے کھاتی ہوئی جا رہی تھی جس میں جگہ جگہ گڑھا تھا۔ میں نے باہر دیکھا تو سڑک کے دونوں طرف دور تک سرسبز و شاداب زمینیں پھیلی ہوئی تھیں، ہریانہ ایک نہایت سرسبز اور مالا مال ریاست ہے۔ مگر اس کی سڑک مفلسی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ سارا کرشمہ اس لفظ کا ہے جو آزادی کے بعد ہر آدمی کے لیے ایک معلوم لفظ بن چکا ہے۔ یعنی پولیٹکل کرپشن۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد یہ عظیم ملک ہمارے لیڈروں کو ملا تو انھوں نے اس کو لوٹ کا دسترخوان سمجھ لیا نہ کہ تعمیر و ترقی کا میدان۔ ایک ہندو بھائی نے کرپال سنگھ بیدار کا یہ شعر سنایا :

بیدار سحر کے ہوتے ہی کچھ اور سیاہی پھیل گئی　　آغاز ہمارا یہ کچھ ہے انجام ہمارا کیا ہوگا

سونی پت پہنچے تو ایک مقام پر سڑک بھینسوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہماری گاڑی ان چلتی پھرتی کالی چٹانوں کے درمیان سے اس طرح گزر رہی تھی کہ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ ان میں سے کوئی دھکا یا سینگ مار کر نئی ڈیلکس ماروتی کو نقصان پہنچا دے۔ تاہم گاڑی نہایت آہستہ چلتی ہوئی خیریت کے ساتھ باہر آ گئی۔ جسٹس تیوتیا نے کہا :

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ میں نے تو بچپن میں اردو فارسی پڑھی ہے۔ ایک عرصہ تک اردو ہی پڑھتا تھا۔ پھر جب وہ بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے تو اردو چھوٹ گئی اور ان کی عام زبان انگریزی بن گئی۔

جسٹس دیبی سنگھ تیوتیا کلکتہ ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے۔ انھوں نے ایک اصول کی بنیاد پر ۱۹۸۸ میں اس عہدہ سے استعفا دے دیا۔ وہ ایک اصول پسند آدمی ہیں اور با اصول موقف (principled stand) کے لیے مشہور ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ملکی حالات میں اصلاح کے لیے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے جب الکشن کمیشن میں اپنی پارٹی (جن ستہ پارٹی) کو رجسٹر کرایا تو معلوم ہوا کہ ہندستان میں تقریباً چار سو پولیٹکل پارٹیاں رجسٹرڈ پارٹی کی حیثیت سے موجود ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ان کی ابتدائی تعلیم لاہور میں اردو اسکول میں ہوئی۔ جب وہ تیسری کلاس میں پڑھتے تھے تو ان کے مسلمان استاد نے ایک شعر بتایا تھا جو اب تک انھیں یاد ہے :

کاٹ لینا ہر کٹھن منزل کا کچھ مشکل نہیں اک ذرا انسان میں چلنے کی ہمت چاہیے

Justice Debi Singh Tewatia
A-27, D.L.F. Qutub Enclave, Phase-I
Gurgaon, Tel. 0124-8-350797

کرنال کے نام سے بہت سی تاریخیں وابستہ ہیں۔ نادر شاہ (۱۷۴۷ - ۱۶۸۸) ایک ایرانی سردار تھا۔ اٹھارویں صدی میں وہ اسّی ہزار کی فوج کے ساتھ ہندستان میں داخل ہوا۔ فتوحات کرتے ہوئے فروری ۱۷۳۹ میں وہ کرنال پہنچا۔ یہاں اس نے مغل فوج کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس کے بعد وہ دہلی میں داخل ہوا۔ یہاں کچھ مسلمانوں نے اس کے ایک فوجی کو مار دیا۔ اس پر وہ سخت برہم ہوا۔ اس نے دہلی میں قتل عام کا حکم دے دیا۔ دہلی کی سڑکوں اور گلیوں میں تیس ہزار آدمی قتل کر دیے گئے۔

نادر شاہ نے نہایت سفاکی کے ساتھ ہندستان میں اپنی حکومت قائم کی۔ تاہم آخر میں خود اسی کے حفاظتی فوجیوں نے اس پر حملہ کر کے جون ۱۷۴۷ میں اسے مار ڈالا۔ نادر شاہ کی موت کے بعد اس کی حکومت بھی منتشر ہو گئی۔

لندن کے البرٹ میوزیم میں نادر شاہ کی ایک تصویر رکھی ہے جو کسی مصور نے ۱۷۴۰ میں بنائی تھی۔ اس تصویر میں اس کے چہرے پر شرعی داڑھی ہے اور ہاتھ میں تسبیح لٹک رہی ہے۔ مگر نادر شاہ نہایت سفاک آدمی تھا۔ اس نے خود اپنے بیٹے کو اندھا کروا دیا۔ کیوں کہ اس کو شبہ ہو گیا تھا کہ اس

کا بیٹا اس کے خلاف سیاسی سازش کر رہا ہے۔ نادر شاہ نے جب دہلی کی مسلم سلطنت کو توڑا اور مسلمانوں کا قتل عام کیا تو دہلی کے ایک بزرگ نے اس پر یہ شعر کہا تھا کہ یہ خود ہمارے اعمال کی شامت تھی جس نے نادر کی صورت اختیار کر لی :

شامتِ اعمال ما صورتِ نادر گرفت

محمد بن قاسم عراق سے اپنی فوج لے کر سندھ آیا۔ اس وقت یہاں راجہ داہر کی حکومت تھی۔ اس نے نہایت آسانی سے ۷۱۲ء میں سندھ کو فتح کر لیا۔ اس سلسلہ میں جسٹس دیبی سنگھ تیوتیا نے بتایا کہ سندھ میں پہلے ایک جاٹ راجہ کی حکومت تھی (جسٹس تیوتیا خود بھی ایک جاٹ ہیں)۔ چچ نامی ایک برہمن اس راجہ کا وزیر تھا، اس وزیر نے محل کے بعض افراد کو ملا کر راجہ کو زہر دے دیا۔ اس کے مرنے کے بعد چچ راج گدی پر قابض ہو گیا۔ داہر اسی کا لڑکا تھا جو چچ کے مرنے کے بعد راج گدی پر بیٹھا۔

اس واقعہ کی بنا پر سندھ کے جاٹ لوگ چچ اور داہر سے بہت ناراض تھے۔ چنانچہ جب محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوا تو جاٹ سرداروں نے محمد بن قاسم کا ساتھ دیا۔ اس طرح داہر کے مقابلہ میں وہ بہت آسانی کے ساتھ کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد ان جاٹوں نے محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کر لی اور محمد بن قاسم نے بھی ان کے ساتھ نہایت اچھے سلوک کیے۔ اسی واقعہ کو بعض ہندستانی مورخین نے اس طرح لکھا ہے کہ محمد بن قاسم کو کچھ بے وفا سرداروں کی غداری سے بہت مدد ملی :

> His work was greatly facilitated by the treachery of certain renegade chiefs. (p. 172)

تقریباً تین گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم لوگ سکندر پور ماجرا (کرنال) پہنچے۔ یہاں ایک اسکول کے وسیع ہال میں جلسہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ کرنال کے علاقہ کے عوام و خواص بڑی تعداد میں اس میں شریک ہوئے۔

یہاں اگرچہ ہریانہ کے دو منسٹر، کئی وکیل اور ڈاکٹر اور پروفیسر وغیرہ بھی آئے تھے۔ تاہم تعداد کے اعتبار سے وہ زیادہ تر ایک عوامی جلسہ تھا۔ مختلف دیہاتوں کے لوگ بڑی تعداد میں جمع تھے۔ جب میں پہنچا تو عورتوں اور بچوں اور بڑوں کی ایک بھیڑ دکھائی دی۔ سب کسان طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

گانے اور باجے کا ایک ہنگامہ جاری تھا۔

میں زیادہ تر کانفرنسوں میں جاتا رہا ہوں۔ وہاں سب کے سب پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں۔ کانفرنس اور سیمنار کا ماحول اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ میں ذاتی طور پر کانفرنس کا آدمی ہوں۔ میں عوامی جلسوں کا آدمی نہیں۔ تاہم میں نے سوچا کہ کانفرنسوں میں جو لوگ آتے ہیں وہ ملک کی آبادی کا کتنا فی صد حصہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دس فی صد سے زیادہ نہیں۔ ملک کے ۹۰ فی صد لوگ یا تو ناخواندہ ہیں یا نیم خواندہ۔

مگر عجیب بات ہے کہ ہندستان میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں وہ ۹۹ فی صد شہروں میں ہوتے ہیں۔ راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے تحت دو سینیر پروفیسروں نے چھ ماہ کی تحقیق کے دوران شہری علاقہ اور دیہی علاقہ میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے اعداد و شمار جمع کیے۔ اس کی روشنی میں انھوں نے دونوں علاقوں کے فرق کو بتانے کے لیے ایک چارٹ بنایا ہے۔ یہ چارٹ بتاتا ہے کہ دونوں قسم کے علاقوں کے درمیان فساد کے اعتبار سے جو تناسب ہے وہ آئس برگ اور اس کی ٹپ جیسا ہے۔

یہاں کے جلسہ میں رام گوپال ایڈووکیٹ (پانی پت) سے ملاقات ہوئی۔ وہ اچھی اردو جانتے تھے۔ انھوں نے اپنے قلم سے میری ڈائری میں لکھا: میں ۱۹۱۴ میں پیدا ہوا۔ ہمارے گاؤں ہنسوارہ (پانی پت) میں سب مل جل کر رہتے تھے۔ مذہب و ملت کی بنا پر کوئی مت بھید نہیں تھا۔ ۱۹۳۹ سے میں شہر پانی پت میں رہنے لگا۔ یہاں شہر میں بھی کسی قسم کا مت بھید نہیں تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ پانی پت کے چودھری ممتاز حسین (ریٹائرڈ تحصیل دار) کا احسان نہیں بھول سکتا۔ میں نے ایف اے تک فارسی اور بی اے تک اردو میں تعلیم حاصل کی۔ باہر کی طاقت بٹوارہ کرنے میں کامیاب ہوگئی (۲۶ اگست ۱۹۹۵)

جلسہ میں جو کارروائیاں ہوئیں ان میں سے ایک یہ تھا کہ گاؤں کی بچیوں نے مل کر گانا گایا اور اس طرح مہمانوں کا سواگت کیا۔ ایک شعر یہ تھا:

ہم یہی دعائیں مانگیں گے لمبی عمر آپ کی کرتار کرے

بہت سے لوگ نوٹوں کا ہار بنا بنا کر لائے اور مہمانوں کو پہنا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ یہ تمام نوٹ جو تقریباً

پچاس ہزار روپے کے تھے، مقامی لائبریری میں دے دیے گئے۔ شری مول چند جین کے جنم دن کو "لائبریری آندولن" کے طور پر منایا جارہا ہے۔ یہ تصور مجھے پسند آیا۔ چار سال پہلے اس گاؤں میں ایک لائبریری بنائی گئی تھی۔ اب وہ ترقی کر کے کافی بڑی ہوگئی ہے۔ اور علاقہ میں جگہ جگہ لائبریریاں قائم ہوگئی ہیں جن سے لوگ فائدہ اٹھارہے ہیں۔ مول چند جین کا کہنا ہے کہ —— "شکھا پستکالوں کے بنا ادھوری ہے۔"

اس جلسہ میں تقریباً پچاس لڑکوں کو انعامات دیے گئے۔ کسی کو جگ، کسی کو ٹفن کیریر، وغیرہ۔ یہ انعامات انھیں پڑھنے کا شوق بڑھانے کے لیے دیے گئے۔

شری مول چند جین نے تقریر کی تو پوری تقریر کے دوران تفصیل کے ساتھ اپنی لائبریری تحریک کا پس منظر بتایا۔ انھوں نے کہا کہ لوگوں کو اگر آپ "نکمے" کاموں سے بچانا چاہتے ہیں تو ان کو پڑھنے میں لگائیے۔ اسی لیے میں نے طے کر رکھا ہے کہ کوئی پڑھے یا نہ پڑھے، مجھے ہر ہر گاؤں میں لائبریری بنانا ہے۔ میں جو لائبریریاں بنارہا ہوں ان میں دوسرے مضامین کے ساتھ ہر مذہب کی کتابیں بھی ہوتی ہیں۔ قرآن کا ترجمہ اور پیغمبر صاحب کی لائف بھی ہماری لائبریری میں موجود ہے۔ یہاں ہماری لائبریری میں چار ہزار سے زیادہ منتخب کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ انھوں نے مطالعہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا: ہماری سمسّیائیں کیوں پیدا ہوئیں، ان کا سمادھان کیا ہے، یہ سب آپ کو کتابوں کے پڑھنے سے ملے گا۔ ہریانہ میں پنچایتیں بنادی گئی ہیں۔ مگر اکثر پنچایتوں کے سرپنچ ان پڑھ ہیں۔ ایسی حالت میں پنچایت کیسے سپھل ہوسکتی ہے۔

سکندر پور ماجرا میں ۱۹۴۷ کے بعد ۸۰ فی صد مکان کچے تھے، آج یہاں سب کے سب مکان پکے بنے ہوئے ہیں۔ یہ گاؤں والوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ لائبریری کی وسیع عمارت بھی پختہ دو منزلہ بنی ہوئی ہے۔

جلسہ کے خاتمہ پر لوگوں نے اپنے اپنے عطیات کا اعلان کیا، کسی نے ۱۰۱ روپیہ دیا۔ کسی نے ۵۰۰۱ روپیہ، کسی نے چھ ہزار روپیہ۔ کسی نے گیارہ ہزار روپیہ کا اعلان کیا، کسی نے ۲۰ ہزار روپیہ دیا۔ ایک صاحب نے اکیاون ہزار روپیہ کا اعلان کیا۔ مجموعی طور پر پانچ لاکھ روپے سے زیادہ کی رقم جمع ہوئی۔ ایک غریب آدمی نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر دیا۔ "انجمن اسلامیہ"

نے بھی ایک ہزار روپے بطور عطیہ دیا۔

یہ تمام رقم شری مول چند جین کو ذاتی طور پر ان کی سالگرہ کی نسبت سے دی گئی تھی۔ مگر انھوں نے اسی وقت پوری رقم لائبریری تحریک کو دے دی۔ یہ جلسہ ایک اسکول کی عمارت میں تھا۔ اس کی دیوار پر ہندی میں لکھا ہوا تھا: ستیہ کی ہی جیت ہوتی ہے۔

اس میں خاص سبق یہ تھا کہ سماج کے سربرآوردہ افراد کی طرف سے اس قسم کا فلاحی کام کیا جائے تو فوراً اس کو قبولیت مل جاتی ہے اور لوگوں کا تعاون اسے مل جاتا ہے۔ شری مول چند جین اس علاقہ کے ایک معروف آدمی ہیں۔ وہ ہریانہ میں منسٹر بھی رہ چکے ہیں۔ اس بنا پر انھوں نے جب لائبریری تحریک اٹھائی تو فوراً اس تحریک کو لوگوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔ سکندر پور ماجرا کے اس جلسہ میں ہریانہ کے وزیر تعلیم بھی شریک تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ ہریانہ کے جس گاؤں میں بھی لائبریری قائم کی جائے گی تو سرکار کی طرف سے اس کو ہر ممکن امداد دی جائے گی۔

وزیر تعلیم نے بتایا کہ میں نے جاپان کا دورہ کیا۔ ایک دن میں وہاں کی ایک فیکٹری میں گیا جہاں کافی عورتیں کام کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہر عورت اپنے سر پر سفید پٹی اور ہاتھ میں کالی پٹی باندھے ہوئے ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس لیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہمیں کارخانہ سے شکایت ہے اس لیے آج ہم اسٹرائک کر رہے ہیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ پھر آپ لوگ کام پر کس لیے جا رہی ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: اسٹرائک الگ ہے اور کام الگ۔ اگر ہم کام نہیں کریں گے تو اس سے دیش کا نقصان ہو گا۔

پروفیسر ہری سنگھ نے کہا کہ میں نے قرآن کا ترجمہ بار بار پڑھا ہے۔ قرآن میں جس گائے کو کاٹنے کا ذکر ہے، اس کا ایک خاص رنگ بتایا گیا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو ہم نیل گائے کے نام سے جانتے ہیں۔ میں خود کہتا ہوں کہ نیل گائے کو مارنا چاہیے۔ وہ فصل کو بہت برباد کرتی ہے۔

ایک بوڑھے ہندو نے کہا کہ ہم بچپن میں سنتے آئے تھے کہ مسلمان بہت برے ہیں۔ کیوں کہ وہ گوشت کھاتے ہیں:

Muslims are bad, because they are meat eater.

اس کے بعد میرا داخلہ ایک کالج میں ہوا۔ وہ ہندو کالج تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہندو بھی میٹ کھاتے

ہیں۔ چنانچہ وہاں دو پارٹی تھی۔ ایک کو ماس پارٹی اور دوسری کو گھاس پارٹی کہتے تھے۔ میں نے پایا کہ خود آریہ سماجیوں میں دونوں قسم کے لوگ ہیں۔ اس تجربہ کے بعد مسلمانوں سے میری نفرت ختم ہوگئی۔

ایک ریٹائرڈ ہندو جج نے کہا کہ یہ سب تو اس وقت کی باتیں ہیں جب کہ زرعی دور تھا اور اکانومی گائے پر مبنی کرتی تھی۔ اب گائے کی اقتصادی قابلیت (economic viability) ختم ہوگئی۔ اب ہل بیل کی جگہ ٹریکٹر آگیا ہے۔ اس لیے اب اس قسم کی بحثوں کو بھی ختم ہوجانا چاہیے۔ اب گائے بھی ویسی ہی ایک جانور ہے جیسے کہ دوسرے جانور۔

واپسی دوبارہ جسٹس دیبی سنگھ تیوتیا کے ساتھ ہوئی۔ راستہ میں مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ جسٹس تیوتیا کی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ ۱۹۹۲ میں وہ پاکستان گئے تو وہاں کے لوگوں نے ان سے بے حد محبت کا اظہار کیا۔ وہاں وہ بالکل اپنوں جیسے ماحول میں رہے۔ انھوں نے بتایا کہ واپسی میں جب وہ لاہور سے دہلی آنے والے جہاز پر سوار ہوئے تو جہاز میں ان کی ملاقات ایک ۸۰ سالہ پاکستانی سے ہوئی۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ لکھنؤ جارہے تھے۔ بوڑھے پاکستانی نے کہا کہ "میں اپنے بیٹے کو اپنی جنم بھومی دکھانے جارہا ہوں"۔ انھوں نے مزید کہا کہ جب میں لکھنؤ کی زمین پر پہنچتا ہوں جو میرا آبائی وطن ہے تو میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

جسٹس تیوتیا نے اپنے سفرِ پاکستان کے بارہ میں اس قسم کے مختلف تجربے بتانے کے بعد کہا کہ ۱۹۴۷ میں یہاں جو جغرافی تقسیم ہوئی اس نے انسانی تقاضوں کو کچل ڈالا۔ اب ضرورت ہے کہ برصغیر کے ملاپ (sub-continental reconciliation) کا پراسس جاری کیا جائے

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ سیاست وہی ہے جو حالات کے اعتبار سے قابلِ عمل ہو۔ موجودہ حالات میں مذہبی سیاست قابلِ عمل نہیں۔ کیوں کہ اس کے موافق ذہنی فضا ملک میں موجود نہیں۔ اس وقت ہم جن حالات کے درمیان ہیں اس میں قابل عمل سیاست صرف ایک ہے، اور وہ سیکولر سیاست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی سیاست فیل ہوگئی، اور اسی طرح ہندستان میں بھی ہندتو کی سیاست فیل ہوگئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ دونوں میں سے کسی بھی ملک میں اس وقت مذہب کے اصولوں پر سیاست چلانے کے مواقع موجود نہیں۔ اگر کسی کو مذہبی نظام لانا ہے تو سب سے پہلے اس کو سماج کے اندر مذہبی ماحول بنانا پڑے گا۔

واپسی میں ہم لوگ سونی پت سے گزرے۔ یہاں کچھ دیر کے لیے چودھری رزق رام ایڈووکیٹ (Tel. 022-760) کے مکان پر ٹھہرے۔ ۸۳ سال کی عمر میں بھی وہ کافی سرگرم نظر آئے۔ ہم لوگ کسی اطلاع کے بغیر یہاں پہنچے تھے۔ جسٹس تیوتیا نے کہا کہ ہم لوگ پیشگی اجازت لیے بغیر آپ کے یہاں آ گئے۔ انھوں نے مسکرا کر جواب دیا: آمدن بہ ارادت، رفتن بہ اجازت۔

چودھری رزق رام نے ایک عجیب بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ سونی پت بہت قدیم سے آباد ہے۔ مکہ کا قبیلہ قریش سونی پت ہی کا تھا۔ پہلے اس کا نام کروونس (Kuruvans) تھا۔ یہاں سے جاکر وہ لوگ عرب میں آباد ہو گئے۔ اس کے بعد وہ قریش کہے جانے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: حضرت صاحب اسی قبیلہ میں پیدا ہوئے۔ ۲۰ اگست کی شام کو ۵ بجے کو یہ بات انھوں نے اپنے مکان پر کہی۔

۱۹ مئی ۱۹۹۵ کی رات کو عشاء کی نماز کے وقت ہم لوگ دہلی واپس آ گئے۔

دو نئی کتابیں

۱۔ دعوتِ حق کے نام سے ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے۔ یہ کتاب ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں دعوت کی اہمیت، اس کے احکام، نیز دعوتی واقعات اور موجودہ زمانہ میں اس کے امکانات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

۲۔ دوسری نئی کتاب کا نام ہے، اسلام ایک تعارف۔ یہ کتاب پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں اسلام کا عمومی تعارف کیا گیا ہے۔ پوری کتاب سادہ اور مثبت انداز میں ہے۔

۱- اپریل ۱۹۹۷ کے آخری ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے بھوپال کا سفر کیا۔ وہاں الرسالہ اکیڈمی کے تحت تین روزہ پروگرام میں شرکت کی۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۲- آلٹرنیٹیو ڈولپمنٹ سنٹر، جے پور کے چیرمین پرہلاد سنگھ شیخاوت (فون ۳۸۲۰۰۴) نے ۷ مئی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو "اسلام اور ہندستان" کے موضوع پر تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کلچرل اتحاد کی بنیاد پر ملکی اتحاد قائم کرنے کا نظریہ ایک خیالی نظریہ ہے جو کبھی کامیاب ہونے والا نہیں۔ کسی بھی سماج میں اتحاد کا راز کلچر کی یکسانیت نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ سماج کے افراد باشعور ہوں۔ وہ اس راز کو جانیں کہ اختلاف ایک فطری حقیقت ہے۔ اس دنیا میں اختلاف کے باوجود مل جل کر رہنے سے اتحاد قائم ہوتا ہے۔ اتحاد کا تعلق ذہنی سوچ سے ہے نہ کہ کسی قسم کے خارجی مظاہر سے۔

۳- ٹائمس آف انڈیا کے چیف سب ایڈیٹر مسٹر کرشنن کٹی نے ۱۷ مئی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے تھا۔ مثلاً آخرت، عبادت، وغیرہ۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ اسلام میں خدا اور بندے کے درمیان کوئی تیسرا وسیلہ نہیں مانا گیا ہے۔ اسلام کے مطابق ہر آدمی براہِ راست خدا کی نگرانی میں ہے، اور خدا ہر ایک کے بارے میں اپنے براہِ راست علم کے مطابق فیصلہ کرے گا۔

۴- ۱۷ مئی ۱۹۹۷ کی شام کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا جس میں تعلیم یافتہ مسلمان شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے تقریباً ایک گھنٹہ کی تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں اصل اہمیت دعوتی ہے۔ دعوت کے مقابلہ میں ہر دوسری مصلحت کی حیثیت ثانوی ہے۔

۵- مسٹر وکرم دت اور ان کی پارٹی نے ۲۸ مئی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا دور درشن کے

لیے ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع ناقص الاعضاء انسانوں کے مسائل پر مشتمل تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام میں یہ تصور نہیں ہے کہ ناقص الاعضاء آدمی اپنے پچھلے جنم کی کسی غلطی کو بھگت رہا ہے اس لیے وہ قابلِ احترام نہیں ہے۔ بلکہ اسلام میں ایسا آدمی دوسروں سے زیادہ قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک بار پیغمبر اسلامؐ کے پاس کچھ سردار لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس درمیان میں ایک نابینا شخص آ گئے۔ پیغمبر سرداروں سے بات کرتے رہے اور نابینا کی طرف التفات نہیں کی۔ اس پر قرآن کی سورہ نمبر ۸۰ میں تنبیہہ اتری۔

۶۔ نیوز اینڈ ویوز الائنس کے چیف ایڈیٹر نسیم نقوی نے ۱۲ جون ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا خصوصی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع زیادہ تر سوامی وویکانند سے متعلق تھا۔ ایک مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا کہ مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کے لیے وحدتِ ادیان کا نظریہ قابلِ عمل نہیں۔ شہنشاہ اکبر کی طاقت، ڈاکٹر بھگوان داس کا علم اور مہاتما گاندھی کی قیادت اس کو حاصل کرنے میں پوری طرح ناکام رہی۔ اس مقصد کے لیے بہترین فارمولا وہ ہے جو سوامی وویکانند نے دیا:

یعنی ایک کو مانو اور کسی سے نفرت نہ کرو (فالو ون اینڈ ہیٹ نن)

۷۔ ہندی اخبار دینک جاگرن کے کرسپانڈنٹ مسٹر اوناش مشرا نے ۱۳ جون ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ۱۹۴۷ سے پہلے اور ۱۹۴۷ کے بعد کے بارے میں ذاتی مشاہدات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم دونوں ابتدائی طور پر اپنی فطرت پر ہوتے ہیں۔ اگر انھیں بہکایا نہ جائے تو وہ بھائی بھائی کی طرح ہی زندگی گزاریں۔ یہ دراصل بہکانے والے لیڈر ہیں جو ان کو فطرت کے راستہ سے ہٹا دیتے ہیں۔

۸۔ کلکی پگناٹرسٹ (مدراس) کی طرف سے راج گھاٹ نئی دہلی میں ۲۸ جون ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع مذاہب میں عبادت کا تصور تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اور اسلامی عبادت اور نماز کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	£50 / $100	

Size: 23.5x16cm,
Pages: 228; Rs. 125

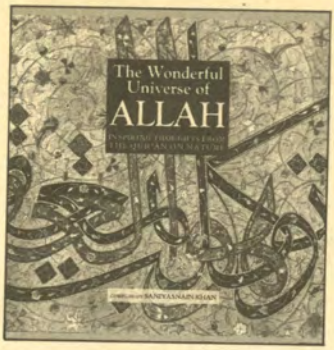

Size: 14x14cm,
Pages: 150; Rs. 95

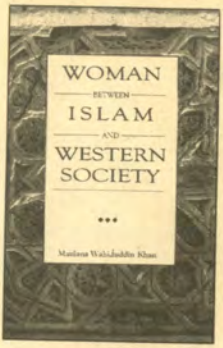

Size: 22x14.5cm,
Pages: 255; Rs. 95

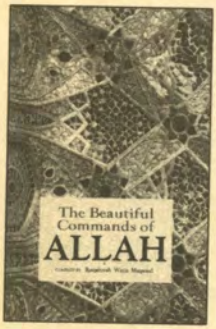

Size: 12.5x19 cm,
Pages: 192; Rs. 125

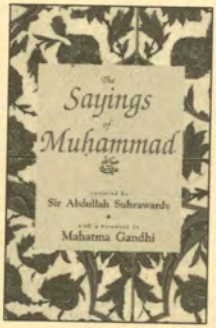

Size: 11.5x15 cm,
Pages: 128; Rs. 75

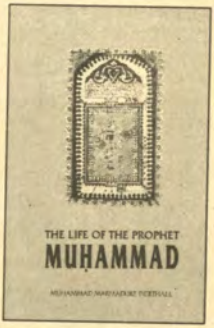

Size: 11.5x15 cm,
Pages: 64; Rs. 75

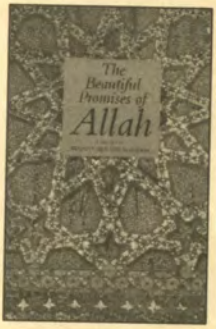

Size: 12.5x19cm,
Pages: 200; Rs. 175

Size: 12.5x19cm,
Pages: 168; Rs. 165

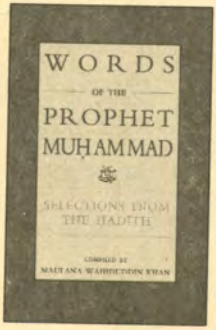

Size: 11.5x15cm,
Pages: 112; Rs. 75

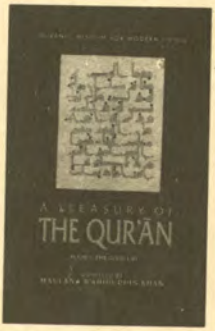

Size: 11.5x15cm,
Pages: 92; Rs. 75

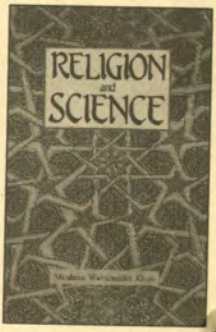

Size: 22x14.5cm,
Pages: 96; Rs. 55

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic.@axcess.net.in.

Finest collection of books on Islam

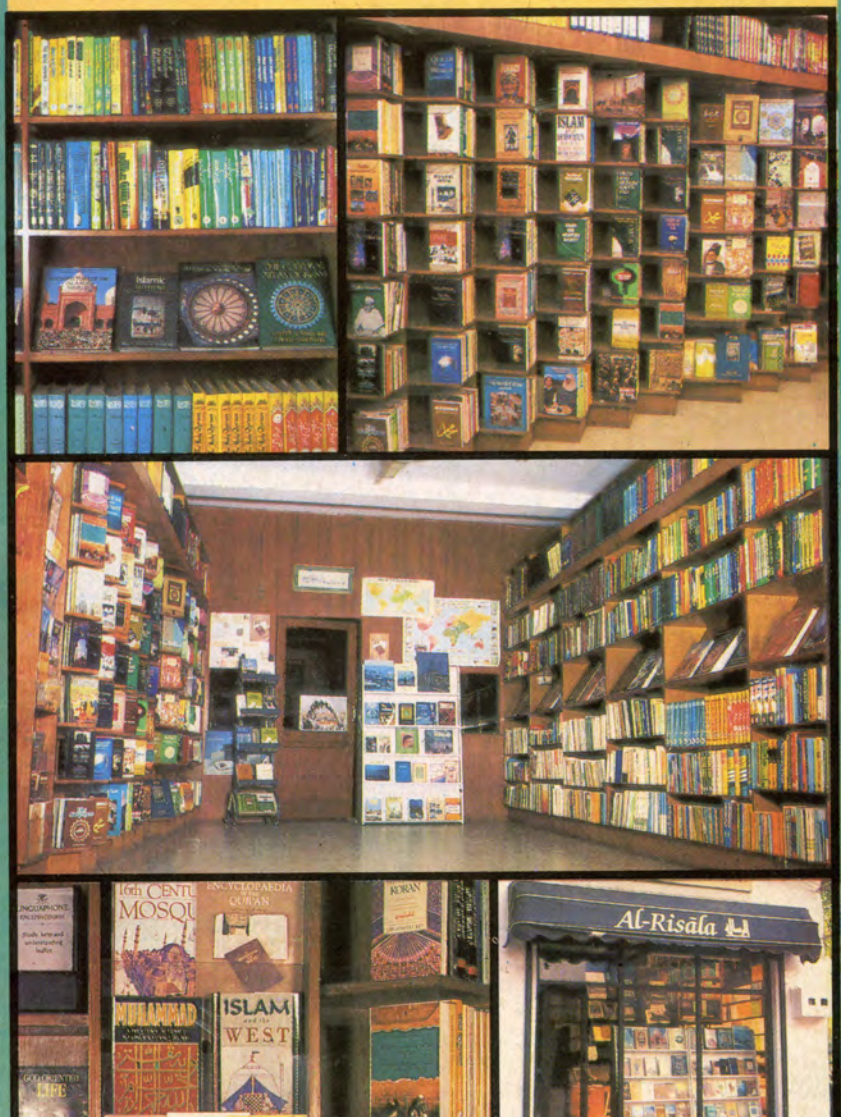

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013

Tel. 4611128 Fax 4697333